مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۱ | شوال المکرم ۱۴۴۱ھ | جون ۲۰۲۰ء | شمارہ ۵

فضائل العلم والخشية

فضائل علمِ دین وخشیتِ حق

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے　　زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

وعظ

فضائل العلم و الخشیۃ
(فضائلِ علمِ دین وخشیتِ حق)

بانس بریلی مدرسہ اشاعت العلوم میں ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۲۹ ہجری کو ۴ گھنٹے تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ موضوع ''فضائل علم دین وخشیت حق'' تھا۔ تقریباً ۵۰۰ افراد نے سنا جبکہ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی نے اسے قلمبند کیا۔

خلیل احمد تھانوی

فضائل العلم و الخشیة
(فضائلِ علم دین وخشیت حق)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	غایت شفقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۹
۲.....	آیات تسلی	۱۰
۳.....	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غم وحزن کا منشاء	۱۱
۴.....	کفار رؤسا کی درخواست	۱۲
۵.....	حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا حال	۱۳
۶.....	تجویز خداوندی	۱۴
	قوت بصر کا حال	۱۵
۷.....	انکار سموٰت محض باطل ہے	۱۵
۸.....	عقل کے غیر محدود ہونے کا حال	۱۶
۹.....	نظری عقل محتاج وحی ہے	۱۶
۱۰.....	ایک صحابی رضی اللہ عنہم کی محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عجیب عالم	۱۷

۱۱.....	حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معنوی حضور.....	۱۹
۱۲.....	اہل دل کا ستانا اچھا نہیں.....	۲۰
۱۳.....	مصیبت زدوں کے لیے دعا کرنا چاہیے.....	۲۰
۱۴.....	لفظی ہمدردی.....	۲۱
۱۵.....	اہل اللہ کی ہمدردی.....	۲۲
۱۶.....	حکایت حضرت جنید وحضرت شبلی رحمہا اللہ.....	۲۲
۱۷.....	اہل اللہ کی عجیب شان.....	۲۳
۱۸.....	بزرگی کی علامت.....	۲۴
۱۹.....	کاملین کی حالت.....	۲۵
۲۰.....	معتقد تقدیر کا حال.....	۲۶
۲۱.....	شدت وحی کا عالم.....	۲۷
۲۲.....	اصل مقصود.....	۲۸
۲۳.....	غم کی حد.....	۲۹
۲۴.....	سبب محزن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.....	۳۱
۲۵.....	مثال تفسیر بالرائے.....	۳۱
۲۶.....	علماء کو وصیت.....	۳۲
۲۷.....	بانی اسلام صرف خدا ہے.....	۳۳
۲۸.....	شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.....	۳۳
۲۹.....	حضرات علماء کا نان ونفقہ.....	۳۴

۳۰..... علماء امور دین میں وقف ہیں..... ۳۶

۳۱..... حقیقت تنخواہ..... ۳۶

۳۲..... خوف میں اعتدال..... ۳۷

۳۳..... اخلاق حسنہ کی حد..... ۳۹

۳۴..... حد شکن لوگ..... ۳۹

۳۵..... اتفاق کی دو صورتیں..... ۴۱

۳۶..... زبانی اتفاق..... ۴۲

۳۷..... جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حال..... ۴۳

۳۸..... اسلام کا مفہوم..... ۴۴

۳۹..... حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حال..... ۴۵

۴۰..... سلطنت کی قیمت..... ۴۶

۴۱..... اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عجیب شان..... ۴۷

۴۲..... حضرات صحابہؓ کی عجیب شان..... ۴۸

۴۳..... غیر قوموں کی تقلید..... ۵۰

۴۴..... اہل دین کا شفقت میں غلو..... ۵۱

۴۵..... کام کرنے کی سہل ترکیب..... ۵۴

۴۶..... خشیت صرف علم سے ہوتی ہے..... ۵۶

۴۷..... آج کل کی تہذیب..... ۵۹

۴۸..... فضیلت علم دین..... ۶۱
۴۹..... اصلاح کے لیے تین امور کی ضرورت..... ۶۲
۵۰..... خشیت حال..... ۶۳
۵۱..... روزانہ اپنے محاسبہ کی ضرورت..... ۶۶
۵۲..... خشیت پیدا کرنے کا طریقہ..... ۶۷
۵۳..... حکایت حضرت صاحب جی ۶۸
۵۴..... تفسیر آیت متلوہ..... ۶۹
۵۵..... اخبار الجامعہ..... ۷۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ)(۱)

غایت شفقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس مضمون کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اس کے لیے چونکہ یہ ٹکڑا کافی تھا اس لیے اس پر اکتفا کیا گیا۔ مضمون کی تعیین آیت کے ترجمہ سے معلوم ہوجائے گی اور اس کا ضروری ہونا بھی اجمالاً ساتھ کے ساتھ ہی معلوم ہوجائے گا۔ اس جملہ کے قبل آیت میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے مضامین ہیں اس جملے سے بھی ان ہی مضامین کی تقویت مقصود ہے۔ بوجہ اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کی مخالفت سے حزن وغم غالب رہتا تھا اور اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غایت شفقت وصفت تراحم (۲) کی ثابت ہوتی ہے یعنی آپ ان لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے بہت ہی بے چین ہوتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ کون سی تدابیر ایسی ہوں کہ یہ لوگ اس کفر وضلالت سے باز آکر سیدھے راستہ پر آجائیں اور عذاب دائمی سے نجات پائیں۔ آپ کی وہ حالت تھی جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے نافرمان بیٹے کی حرکات پر کڑھتا ہے

(۱) ''خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے'' سورہ فاطر: ۲۸ (۲) صفت رحمت

اور پریشان ہوتا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی تدبیر میں لگا رہتا ہے، کبھی مصلحین سے مشورہ کرتا ہے کبھی کسی سے دعا کراتا ہے کبھی تعویذ لکھواتا ہے کہ کسی طرح یہ ٹھیک رستہ پر آجائے۔ غرض اس کو بیٹے کی نافرمانیوں پر اس سے عداوت (۱) نہیں ہوتی بلکہ اس پر رحم آتا ہے اور کڑھتا ہے اگر کبھی اس کو اپنے گھر سے نکالنے کا قصد بھی کرتا ہے تو بہ نیت ادخال (۲) کے کرتا ہے۔ اس کو چھوڑ دینے یا اس سے قطع تعلق کر لینے کی نیت کبھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کفار سے یہ حالت تھی کہ تمام عمر آپ کو یہی غم لگا رہا۔

آیات تسلی

حتی کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کے لیے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ''(۳) جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ''لَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ''(۴) کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے ''لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ''(۵) کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے تعمیل کرالیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر (۶) کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہی ہوئے۔ پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ (۷) ایک جگہ فرماتے ہیں: وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنتَ تُكْرِهُ

(۱) دشمنی (۲) اس نیت سے کرتا ہے کہ ٹھیک ہو جائے تو پھر گھر میں رہنے کی اجازت دیدے گا (۳) سورۃ الشعراء: ۳ (۴) سورۃ البقرۃ: ۱۱۹ (۵) سورۃ الغاشیۃ: ۲۲ (۶) داروغہ کا ہے (۷) ''اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو، پھر کوئی معجزہ لے آؤ'' سورۃ الانعام: ۳۵

النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱) کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گو ان کی قسمت میں دولت ایمان نہ ہو۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے "وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ "(۲) ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ (۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غم وحزن کا منشاء

غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن وغم تھا۔ نیز ان آیات سے اس کے مبنی (۴) کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر وضلالت سے باز آجائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت (۵) اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردی حالت (۶) پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آجانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ یہ لوگ ساری عمر اس کفر وگمراہی کے تیرہ وتاریک (۷) غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لیے انسان خیر خواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادتاً اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیر خواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتی کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنی حالت درست کرلیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رؤسا مکہ نے یہ درخواست کی کہ آپ ان غریب لوگوں کو جو کہ آپ کے پاس ہیں ہمارے آنے کے وقت علیحدہ کردیا کریں تو ہم ایمان لے

(۱) سورۃ یونس: ۹۹ (۲) "کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہوجائے" (۳) "کہ جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے سو آپ تسبیح وتحمید میں لگئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنالیجئے کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہوجائے گی اور یہ غم ہلکا ہوجائے گا" سورۃ الحجر: ۹۷، ۹۸ (۴) اس کی وجہ (۵) ذاتی دشمنی اور کدورت نہ تھی (۶) بری حالت (۷) تنگ اور اندھیری غار

آئیں۔ جیسا کہ آج کل کے رؤسا کہ وہ بھی اس قسم کی فرمائش علماء سے کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ اگر ان جولاہے تیلیوں کے مساجد وغیرہ میں آنے سے روک دیا جائے تو ہم مساجد میں آنے لگیں اور جماعت سے نماز پڑھنے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا کہ کسی سقے یا جولاہے کے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوں حالانکہ ان کو غیرت کرنی چاہیے اس لیے یہ کہنا کہ ہم ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے درحقیقت اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ یہ خود اس قابل نہ ہوسکے کہ امامت کا منصب ان کو عطاء ہوتا اور یہ دوسروں کے امام بنتے، غریب لوگ تو بیچارے خود ہی دب جاتے ہیں اگر ان میں لیاقت اور قابلیت ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ اگرچہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں لیاقت نہیں ہے کیونکہ آج کل روشن دماغی کے زمانے میں ذرا سا دنیاوی عزوجاہ بھی لیاقت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ دنیادار لوگ کچھ ایسے مغرور ومست ہوتے ہیں کہ گو وضو کے فرائض وسنن سے بھی واقفیت نہ رکھتے ہوں لیکن اپنے کو علوم دین ودنیا دونوں کا محقق سمجھتے ہیں حالانکہ واقفیت یہ ہے کہ:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست(۱)

کفار رؤسا کی درخواست

میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس صاحب کو عید کی امامت کا شوق پیدا ہوا اور وہ امامت کو چلے اس کے قبل کبھی کیوں امامت کی تھی بلکہ شاید نماز کا بھی کبھی کبھی اتفاق ہوتا ہو اور وہ بھی کسی مجبوری ہی کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تکبیرات بھول گئے اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کروں، آخر میں نے تکبیرات بتلائیں تو انہوں نے پوری کیں۔ جب یہ حالت ہے تو اب بتلایئے اگر سقے (۲) امامت نہ کریں تو کون کرے اور وہ بیچارے بھی آگے نہ بڑھیں تو کون بڑھے تو جیسے ان کی حالت ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی رئیسوں کی یہی حالت تھی اس لیے ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ ہمارے آنے کے وقت ان لوگوں کو ہٹادیا کیجئے تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا

(۱) ''بعض عقلمند سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کچھ رتبہ حاصل کرلیا ہے حالانکہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سوائے تکبر اور بڑائی کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا'' (۲) پانی بھرنے والے ماشکی۔

کریں۔ حضور ﷺ کو براہ شفقت کہ شاید اسی سے یہ لوگ کچھ مانوس ہوں اور رفتہ رفتہ راہ راست پر آجائیں ان کی درخواست کو منظور فرمانے کا کچھ خیال ہوا لیکن خدا تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ان کی درخواست منظور فرمانے سے منع فرمایا اور درخواست کو مسترد کردیا۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ (۱) کہ آپ کبھی ان لوگوں کو نہ ہٹائیے ان کا کچھ لین دین آپ سے نہیں ہے اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ بے موقع کام کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

یہ بات طالب علموں کے یاد رکھنے کی ہے کہ حضور ﷺ کی تجویز کو جو خدا تعالیٰ نے ظلم فرمایا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور ﷺ کی تجویز ناجائز کیونکہ لفظ ظلم کلی مشکک ہے جس کے افراد مختلف مراتب کے ہیں۔ جیسا کہ امر ممنوع کو ظلم (۲) کہا جاتا ہے اسی طرح اس امر جائز حسن کو بھی کہ اس کے مقابلے میں کوئی امر اس سے احسن ہو ظلم (۳) سے تعبیر کردیا جاتا ہے تو حضور ﷺ نے جو تجویز فرمائی تھی وہ حسن تھی جیسا ابھی آتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز اس سے احسن تھی اس لیے اس کے اعتبار سے اس کو نامناسب کہہ دیا گیا ہے اور حضور ﷺ کی تجویز کا حسن ہونا ظاہر ہے کہ اس تجویز سے یہ نیت تھی کہ کفار ہدایت پاجائیں اور اپنی حالت موجودہ سے نکل جائیں اور ظاہر ہے کہ اہتمام ہدایت حسن (۴) ہی ہوگا اس کے حسن ہونے میں شبہ ہی نہیں ہوسکتا۔

حضرات صحابہ کرامؓ کی رسول اکرم ﷺ سے محبت کا حال

رہا یہ شبہ کہ تجویز اگرچہ کفار کے لیے ہدایت کا سامان تھی لیکن اس سے مسلمانوں کی تو دل شکنی ہوتی تو سمجھ لو کہ صحابہ کرامؓ کو حضور ﷺ سے ایسی محبت تھی اگر آپ ان کی دھجیاں بھی اڑادیتے تو ان لوگوں کے دل پر ذرا میل نہیں آسکتا تھا وہ بزبان حال یوں کہتے تھے کہ:

ہرچہ آں شیریں کند خسرو بود (۵)

(۱) سورۃ الانعام: ۵۲ (۲) جیسے منع شدہ کام کرنے کو ظلم کہتے ہیں (۳) اس سے زیادہ عمدہ ہو (۴) ہدایت کا اہتمام کرنا عمدہ ہی ہوگا (۵) ''جو کچھ وہ شیریں کردیتا ہے وہی پسندیدہ ہوتا ہے''

اوران کی آپ کے ساتھ یہ حالت تھی:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو(۱)

جن کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ تھوکتے تو اس کو زمین پر نہ گرنے دیتے تھے ہاتھوں میں لیتے اوراپنے چہرے پر مل لیتے اوراگر ہاتھ میں نہ آتا تو دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر چہرے کو مل لیتے اور بزبان حال یوں کہتے ہیں کہ:

مرا از زلف تو موے بسندست ہوس را رہ مدہ بوے بسند ست(۲)

تو جن عشاق کا یہ مذہب ہو کہ:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی(۳)

ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی ضیع مبارک(۴) کیونکر ناگوار ہوسکتا تھا تو یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ صحابہؓ کی دل شکنی ہوتی۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فعل اپنی ذات میں حسن تھا مگر احسن کے مقابلہ میں اس کو نامناسب کہہ دینا کچھ مضائقہ نہیں۔

آسمان نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود(۵)

تجویز خداوندی

پس چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز احسن تھی اس لیے اس کے سامنے اس تجویز نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے موقع فرمادیا۔ باقی اس تجویز خداوندی کا احسن ہونا غور کرنے سے معلوم ہوگا کیونکہ یہ بہت زیادہ نظری ہے(۶) اس لیے کہ سب سے زیادہ نظری وہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لیے وحی کی ضرورت ہو اور عقول قدسیہ(۷) بھی اس تک بلاوحی نہ پہنچ سکیں۔ مجھے اس موقع پر ایک بڑی بات یاد آئی۔ ہمارے زمانہ کے عقلاء بڑی غلطی میں ہیں

(۱)''اگر تو زندہ کرتا ہے تو یہ تیری عطاء ومہربانی ہے اور تو موت دے تو میں تیرا ہوں میری جان تجھ پر قربان ہے تو جو بھی کچھ کرے تیری رضا پر راضی ہوں'' (۲)''تیرے بال میری زلفوں کے چند پسندیدہ بال ہیں ہوس کے لیے راستہ مت کھولو کہ بہت ہی پسندیدہ خوشبو ہے'' (۳)''دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ ہو عاشقوں کا سر سلامت رہے کہ اسی پر آپ خنجر آزمائی فرمائیں'' (۴) کوئی مبارک کام (۵)''عرش الٰہی کے مقابلہ آسمان نیچے درجہ میں ہے لیکن تیری زمین کے مقابلہ میں ہزاروں درجہ بلندی پر ہے'' (۶) گہری بات ہے (۷) پاکیزہ عقلیں۔

کہ وہ تمام نظریات کو عقل سے دریافت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نظریات کی دو قسم ہیں۔ ایک وہ نظریات کہ محض نظر اور فکر (۱) ان کے ادراک کے لیے کافی ہوجائے، سماع اور نقل پر موقوف نہ ہو (۲)۔ دوسرے وہ نظریات کہ اس میں عقل کے ساتھ نقل کی بھی ضرورت ہو۔ سو ایسی نظریات بغیر انضمام نقل شرعی (۳) عقل وفکر سے حل نہیں ہوسکتی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہمارے بعض دنیاوی معاملات بھی ایسے ہیں کہ ان کی نسبت جب تک کہ خود صاحب واقعہ بیان نہ کرے اس وقت تک دوسرے کو کچھ بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ مثلاً فریمسن زونا کہ اس کے رازوں کو کوئی دریافت نہیں کرسکتا خواہ کتنا ہی عقل مند ہو اس لیے کہ وہ راز معقول محض نہیں کہ عقل سے دریافت ہوسکیں بلکہ ان میں نقل کو بھی دخل ہے تو جب تک کہ نقل کی بھی آمیزش نہ ہو ان کا پتہ نہیں چل سکتا اور نقل مفقود ہے (۴) اس لیے کسی کو معلوم نہیں کہ وہاں کیا کیا معاملات ہوتے ہیں اور فریمسن ہونے والے کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر چیز کو اپنی عقل نارسا سے دریافت نہیں کرسکتے۔

قوت بصر کا حال

اور اس میں راز یہ ہے کہ ہر قوت کی ایک حد ہوتی ہے کہ وہ قوت اس حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل (۵) ہوجاتی ہے۔ مثلاً آنکھ کہ اس کا کام دیکھنا ہے مگر وہ ایک خاص حد تک دیکھتی ہے جو لوگ آسمان کے منکر ہیں وہ بھی اس مسئلے کو مانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ نیلگوں سطح جو جانب فوق (۶) میں ہم کو نظر آتی ہے یہ حد بصر ہے (۷) یعنی آنکھ کی قوت اس حد تک جا کر ختم ہوجاتی ہے آگے کام نہیں دیتی اس لیے یہ رنگ محسوس ہوتا ہے تو قوت بصر کا محدود ہونا تسلیم کیا۔

انکار سموٰت محض باطل ہے

اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس حالت میں انکار سموٰت محض باطل ہے (۸)

(۱) غور وفکر (۲) سننا اور منقول ہونا اس کے لیے کافی نہ ہو (۳) شرعی احکام کی نقل کے بغیر (۴) نقل موجود نہیں (۵) بیکار (۶) اوپر کی جانب (۷) بینائی کی حد (۸) آسمانوں کے وجود کا انکار۔

کیونکہ اس حد سے آگے ہونے کا احتمال باقی ہے یا مثلاً آپ کے کان کہ ان میں سننے کی قوت ہے لیکن وہ ایک مقررہ حد تک کی آواز کو سن سکتے ہیں کبھی کسی نے بریلی میں بیٹھ کر کلکتہ کی توپ کی آواز نہ سنی ہوگی حالانکہ یہاں ایک ذریعہ بھی موجود ہے کیونکہ جرم ہوا(۱) کہ جس کے ذریعے سے کان میں آواز پہنچتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک متصل واحد ہے کیونکہ خلا منتفی ہے اب خواہ انتفاء امتناع عقلی ہو یا عدم عادی(۲) لیکن واقع یوں ہے کہ خلا کا وجود نہیں اور لیجئے آپ کی ناک کہ جس میں قوت شامہ مودع ہے(۳) کبھی یہاں بیٹھے ہوئے لکھنؤ کے عطر خانہ کی خوشبو محسوس نہیں کرتی۔

عقل کے غیر محدود ہونے کا حال

پس جب تمام قوی(۴) ایک حد تک کام کر سکتے ہیں اور اس سے آگے عاجز ہیں تو عقل کہاں سے غیر محدود ہوگئی کہ اس کی قوت کا سلسلہ غیر متناہی چلا جائے اور کہیں ختم ہی نہ ہو بلکہ جیسے اور قوی ایک مقام تک جا کر معطل(۵) ہو جاتے ہیں اسی طرح عقل بھی اس حد تک پہنچ کر کہ وہ نقل ہے عاجز ہوگی خواہ نقل خدا کی ہو یا انسان کی۔ صاحبو! اگر عقل سے ہر بات دریافت کی جاسکتی ہے تو کیا وجہ کہ جب کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ پیش آتا ہے اس میں وکلاء سے رائے لیا کرتے ہو کیونکر اس کے ہر پہلو کو اپنی عقل سے دریافت نہیں کر لیتے اور کیا وجہ کہ عقل سے ایک قانون تجویز کر کے حاکم کے سامنے پیش نہیں کر دیتے، کیا وجہ کہ ہائیکورٹ کے نظائر کی تلاش کی جاتی ہے کیا کسی صاحب کے پاس اس کا جواب ہے اور اگر کبھی کسی شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات آجائے تو کیا وہ جرأت کر سکتا ہے کہ خود یا بذریعہ وکیل خلاف قانون ہائیکورٹ کے ججوں کے سامنے پیش کر دے ہرگز نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ خلاف قانون کوئی بات پیش کرنے سے حاکم کان پکڑ کر اجلاس سے باہر کر دے گا۔

نظری عقل محتاج وحی ہے

افسوس مسلمانو! اگر ایک جج اس بناء پر کہ قانون کے خلاف کو قابل سماعت نہ

(۱) ہوا کا وجود (۲) عقلاً وہاں تک رسائی نہ ہو یا عادۃً معدوم ہو (۳) سونگھنے کی طاقت رکھی گئی ہے (۴) اعضاء (۵) بیکار

سمجھے اور قانون کی دلیل پوچھنے کو گستاخی قرار دے کر کان پکڑ کر نکال دے تو اس کو متعصب نہ کہا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام میں اگر کوئی عالم یہی بات کہے کہ خلاف قانون شرعی قابل سماعت نہیں (۱) نہ حکمت پوچھنے کا ہر شخص کو منصب ہے تو اس عالم کو متعصب کہا جائے۔ حیف صد حیف (۲) کہ ہائی کورٹ کے جج کی تجاویز تو سب بلاتعین حکمت عقل کے موافق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجاویز میں چوں وچرا کی جرأت کی جائے۔ غرض جہاں تک عقل نہیں پہنچ سکتی وہ نظرِ وحی کی محتاج ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ وہ کونسا تھا جس تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر نہیں پہنچ سکی اور نہ پہنچ سکتی تھی۔ وہ جزو یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ایمان لے آنے کا احتمال تھا۔ خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بتلادیا کہ یہ ایمان تو لائیں گے نہیں پھر ان کے لیے کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے صرف تبلیغ واجب ہے مگر اہتمام فضول ہے۔ اسی کو فرمایا ہے: انا اعتدنا للظالمین نارا (۳)

غرض آپ کی اس تجویز کی وجہ یہ تھی اور اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو کبھی آپ مسلمانوں کو علیحدہ کرنا گوارا نہ فرماتے۔ اب جبکہ معلوم ہوگیا تو یہی تجویز احسن تھی کہ خواہ آئیں یا نہ آئیں ان کو علیحدہ نہ کیا جائے گا۔ یہ شرح اس آیت کی کہ میرا مقصود اس آیت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ کبھی آپ کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے کفار کے ایمان لے آنے کی امید پر ان کی جدائی کو بھی گوارا فرمالیا۔

ایک صحابیؓ کی محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عجیب عالم

اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت کی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے ایک مرتبہ آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ یہ تو امید ہے کہ ہم جنت میں جائیں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا درجہ جنت میں ہم سے بہت اعلیٰ

(۱) جو بات شرعی قانون کے خلاف ہو سننے کے قابل نہیں (۲) بہت افسوس کی بات ہے (۳) ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے سورۃ الکہف: ۲۹۔

ہوگا تو جب ہم کو آپ ﷺ کا دیدار نصیب نہ ہو سکے گا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے۔ خوب کہا ہے:

باتو دوزخ جنت ست اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا(۱)

اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ (۲) کہ اگرچہ حضور ﷺ کا مرتبہ اعلیٰ ہوگا لیکن تم لوگ دیدار نبوی ﷺ سے محروم نہ رہو گے بلکہ تم لوگ بھی اس مقام تک پہنچ جایا کرو گے جیسے دنیا میں گو مکان الگ الگ ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے اس کے گھر چلے جاتے ہو تو اسی طرح وہاں بھی گو مکان الگ الگ ہوں گے مگر ملاقات ہو سکے گی۔ ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ (۳) کہ جو تمہارا جی چاہے گا وہاں تم کو ملے گا تو اگر کسی کا یہ جی چاہے کہ میں ہر وقت زیارت نبوی ﷺ سے مشرف رہوں تو ضرور اس کو زیارت ہو سکے گی۔ رہی یہ بات کہ ایسی خواہش کسی کو پیدا ہوگی یا نہیں یہ ہم کو معلوم نہیں ہے یہ وحی کے متعلق ہے ممکن ہے کہ بعض کو یہ دولت نصیب ہو بعض کو نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ جس کو یہ دولت نصیب ہوگی کیا وہ ہر وقت حضور ﷺ ہی کے گھر پر پڑا رہے گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اپنے گھر ہی بیٹھے بیٹھے ہر وقت زیارت سے مشرف ہوتا رہے جس کی صورت یہ ہو کہ خدا تعالیٰ نظروں میں ایسی قوت پیدا کر دیں کہ وہ درمیان کی حائل چیزوں کو پار کر کے وہاں تک پہنچ جائیں اس زمانے میں بھی ایسے آلات ایجاد ہوئے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بہت دور دور کی چیزیں دکھلا دیتے ہیں (۴) اور درمیان کے پردے سب دور ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اگر نظروں میں ایسی قوت پیدا کر دے تو کیا بعید ہے اور نظیر اس لیے بیان کی گئی کہ آج کل کے روشن دماغ لوگ جب تک کہ ولایت کی کوئی نظیر نہ ہو اس وقت تک منصوصات (۵) کو نہیں مانتے ورنہ ہم کو تو

(۱) آ محبوب دوزخ بھی تیرے ساتھ رہ کر تو گویا جنت ہے اور اے میرے دل کے بسنے والے تیرے بغیر تو جنت بھی گویا دوزخ ہی ہے" (۲) "جس کسی نے اللہ و رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کی وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء" سورۃ النساء:۶۹ (۳) سورۃ فصلت:۳۱ (۴) جیسے ٹی وی اسکرین پر (۵) جو احکام قرآن و حدیث میں منقول ہیں۔

شرم آتی ہے کہ خدائی خبریں منوانے کے لیے یورپ کی صنائع پیش کریں۔ غرض صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جنت میں جانا بھی اس وقت تک ان کو پسند نہ تھا جب تک کہ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہ ہو۔

دیدہ از دیدنش نہ کشتے سیر　　ہمچناں کز فرات مستسقی(۱)

حضرات صحابہؓ کا معنوی حضور

تو باوجود اس کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا کرلیا کہ تھوڑی مدت کے لیے یہ لوگ نظر سے غائب رہیں اور حقیقت میں یہ غَیبت ظاہری تھی ورنہ اصل غَیبت نہ تھی۔ صحابہؓ کی تو یہ حالت تھی کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

گو اس حضور اور ظاہری حضور میں فرق بھی ہے اور یہی معنوی حضور ہے کہ جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو سب سے بڑے محب تھے وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل رہے۔ یعنی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورنہ کیا ممکن ہے کہ ایسے سانحہ عظیم کی حالت میں اتنی محبت مضبوط رہنے دے یہ اسی معائنہ کی بدولت ہے ہم اس کا اندازہ نہیں کرسکتے کیونکہ ہم خود ہی اس سے بے بہرہ ہیں تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گو پوری غیبت نہ ہوتی مگر یہ ظاہری غیبت بھی کب گوارا تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان لوگوں کے ایمان لانے کے احتمال پر اس غیبت کو گوارا فرمالیا۔ یہاں سے بطور تفریع کے کہتا ہوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شفقت تھی تو ورثۃ الانبیاء کو بلکہ ہر فرد اُمت کو کیونکہ ہر فرد اُمت من وجہ وارث ہے (۲) کیونکہ منشاء وراثت علم دین ہے کیا کوئی فرد بشر اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دین سے بالکل بے بہرہ ہے ہرگز نہیں۔ خواہ وہ علم لا الٰہ الا اللہ (۳) ہی کا ہو اور جب ہر فرد اُمت کو یہ علم ہے تو کوئی مسلمان وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج نہیں تو جب آپ وارث ہوئے تو آپ کے ذمہ بھی وہی حق ہوگا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) ''اس کے دیکھنے سے آنکھ کا جی نہیں بھرتا ایسے ہی جیسے دریائے فرات پر بھی پیاس کی بیماری والے کی پیاس نہیں بجھتی'' (۲) کیونکہ حضور کی امت کا ہر فرد وراثت نبوی کا وارث ہے جو علم ہے (۳) صرف توحید ورسالت کا علم ہو یعنی مسلمان ہو۔

کیا یعنی آپ اپنے مخالفین سے وہی برتاؤ کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، یعنی شفقت۔

اہل دل کا ستانا اچھا نہیں

آج کل یہ حالت ہے کہ ذرا سے اختلاف میں عداوت اور تنفر ہو جاتا ہے(۱) بلکہ بعض لوگ تو اپنے مخالف کے اس قدر درپے ہوتے ہیں کہ اس کو دنیاوی نقصان بھی پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے اس کو کوئی دنیاوی نقصان پہنچ جائے تو اس کو اپنی کرامت اور اپنی بددعا کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اہل دل کا ستانا اچھا نہیں اس سے طرح طرح کے نقصان ہوتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد تادلے صاحبدلے نامد بدرد(۲)

خواجہ حافظ کہتے ہیں:

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات بادرد کشاں ہر کہ درآویخت برآویخت(۳)

مصیبت زدوں کے لیے دعا کرنا چاہیے

تو یہ بات بالکل سچ ہے مگر یہ کسی کو کب جائز ہے کہ وہ اپنے کو ایسا سمجھے ہاں البتہ اگر کوئی دوسروں کی نسبت یہ گمان کرے تو بیجا نہیں اور اس وقت بھی بیجا نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دیکھ کر خوش ہو بلکہ غمگین ہونا چاہیے اور ان کے لیے دعا کرنا چاہیے اور یہ حالت ہونی چاہیے کہ جیسے کسی کا لڑکا کہ وہ جوا کھیلتا تھا اور اس میں پکڑا گیا تو دیکھئے کہ اس کے باپ کی کیا حالت ہوگی، اگرچہ اس خبر کو سن کر زبان سے یہ کہہ دے گا کہ اچھا ہوا پکڑا گیا لیکن دل کی یہ حالت ہوگی کہ بیقرار ہو جائے گا تدبیریں کرے گا دعائیں کرائے گا اور جگہ جگہ کہتا پھرے گا بلکہ اگر کوئی اس کے سامنے یہ تذکرہ کرے گا تو اس کو ناگوار ہوگا، لوگ اگر عیادت کو آئیں گے تو ان کی عیادت لے گا تو صاحبو! کیا وجہ ہے کہ اگر اپنے بیٹے پر کوئی مصیبت آجائے تو قلب کی یہ حالت ہو جائے اور کسی دوسرے مسلمان پر کوئی مصیبت آئے تو دل کو اثر بھی نہ ہو، میں اس کی شکایت کرتا

(۱) دشمنی اور نفرت (۲) ''جب تک کسی صاحب دل کے دل کو درد نہیں پہنچتا رسوائی نہیں ہوتی'' (۳) ''یہ دنیا ادلے بدلے کی ہے ہم نے اس دنیا میں بہت تجربہ کیا ہے کہ جو شرابیوں کے ساتھ لپٹ گیا وہ لپٹ ہی گیا''۔

ہوں۔ ہاں اگر شفقت کی وجہ سے غصہ ہو تو وہ برا نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی کے غصے کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی شخص ان کے غصے سے بچتا ہو لیکن باوجود اس کے کبھی کسی کو ناگوار نہ ہوتا تھا اس لیے کہ وہ خلوص سے ہوتا تھا۔ خوب کہا ہے:

محبت ہو کسی سے یا عداوت مزادی جائے گی جو دل سے ہوگی

صاحبو! تمہارے پاس دل نہیں تمہاری ہمدردی محض لفاظی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

لفظی ہمدردی

میں آج کل کے مدعیان ہمدردی کے لیے ایک مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ اگر ایک ایسے شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دی جو کہ اپنے گھر سے خوشحال ہے ایسا کہ اگر نوکری نہ بھی کرے تو اس کی ضروریات پوری طور سے چل سکتی ہیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرا ایسا شخص درخواست دے کہ وہ بالکل مفلوک الحال ہے ایسا کہ اگر اس کو یہ ملازمت نہ ملے تو کھانے پینے کی ضروریات بھی اس کی مشکل سے پوری ہوں اور یہ خوش حال صاحب درخواست دینے میں مقدم ہو گئے اور وہ غریب دوسرے نمبر پر ہو گیا تو ہم نے آج تک کسی مدعی ہمدردی کو نہیں سنا کہ اس نے اس غریب آدمی کی غربت پر خیال کر کے اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور میں اہل اللہ میں ہزاروں نظیریں اس سے زیادہ دکھلادوں جو کہ دنیا داروں میں کبھی نہیں ہوسکتیں۔ ہاں دنیا داروں میں ایک وضعداری ہے کہ دنیا کی لاج کے مارے اس کو نباہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک تو ہمدردی نہیں ہوتی اور دوسرا فرق ان میں اور اہل اللہ میں یہ ہے کہ اللہ والے کریں گے بہت کچھ اور کہیں گے کچھ نہیں اور یہ لوگ کریں گے خاک نہیں اور دنیا بھر میں غل مچاتے پھریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں، دنیاوی غرض ان کی نہیں ہوتی اور یہ جو کچھ کم و بیش کرتے بھی ہیں تو محض دنیاوی اغراض کے لیے اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ ان دنیاداروں کی ہمدردی کو بقاء ودام نہیں ہوتا کیونکہ دنیا جس کے لیے یہ ہمدردی کرتے ہیں خود فانی اور متغیر ہے[1] اس کے حالات

(۱) ختم ہونے والی اور بدلتی رہتی ہے۔

اغراض و مصالح بھی بدلتے رہتے ہیں صبح کچھ ہے تو شام کچھ ہے تو جب مصالح دنیا متغیر ہیں (۱) تو ان کی ہمدردی باقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں بھی تغیر پیش آئے۔ ممکن ہے کہ کل سچ بولنے میں دنیوی مصلحت تھی اور آج جھوٹ بولنے میں دنیاوی مصلحت ہے۔

اہل اللہ کی ہمدردی

اور اہل اللہ کی ہمدردی قائم ودائم ہے کیونکہ جس ذات کے خوش کرنے کے لیے وہ ہمدردی کرتے ہیں وہ خود غیر فانی ہے (۲) پھر غرض ان کی ایک متعین ہے خدا تعالیٰ کو خوش کرنا اور وہ جس امر سے آج خوش ہیں قیامت تک اسی سے خوش ہیں۔ نیز دنیاداروں کی ہمدردی تو محض قومی ہمدردی ہے یعنی وہ جو کچھ کم زیادہ ہمدردی کرتے ہیں اپنی قوم سے من حیث القوم کرتے ہیں اور اہل اللہ کی ہمدردی عام ہمدردی ہے کہ وہ ہر شخص سے وہی برتاؤ شفقت کا کرتے ہیں جو اپنوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جانوروں تک سے ہمدردی ہوتی ہے ان کی وہ شان ہوتی ہے جس کو فرمایا ہے وما ارسلنك الا رحمة للعالمین (۳) کہ تمام جہان کے لیے ان کی ذات بابرکات رحمت خداوندی ہوتی ہے۔ چنانچہ ملادوپیازہ نے اپنے آل نامہ میں لکھا ہے ''الرسول خیر خواہ دشمناں'' (رسول دشمنوں کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے)

حکایت حضرت جنیدؒ وحضرت شبلیؒ

حضرت جنیدؒ کو ایک مرتبہ خلیفہ وقت نے کسی بات پر برہم ہوکر بلا بھیجا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے جب روبرو ہوئے تو خلیفہ نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ حضرت شبلیؒ چونکہ نوجوان تھے، نیز ان کے پیر کو برا بھلا کہا جارہا تھا آپ کو جوش آیا قالین پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی آپ نے اس پر نظر ڈالی تو وہ شیر مجسم ہوکر خلیفہ کی طرف خشم آگیں نظر (۴) سے دیکھنے لگا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی جو اس پر نظر پڑی تو آپ نے حضرت شبلیؒ کو گھور کر دیکھا اور اس شیر کو تھپک دیا وہ مثل سابق شیر قالین ہوگیا۔

(۱) جب دنیاوی مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں (۲) ہمیشہ رہنے والی ذات ہے (۳) سورۃ الانبیاء: ۱۰۷ (۴) غصیلی نظروں میں

تھوڑی دیر میں حضرت شبلیؒ نے پھر اسے اشارہ کیا اور وہ پھر مجسم ہو کر سامنے ہوا اس مرتبہ خلیفہ وقت کی نگاہ بھی اس پر پڑی، خوف کے مارے تھرا گیا اور دست بستہ اپنی جرأت کی معافی چاہی۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس شیر کو تو فوراً مثل سابق کر دیا اور خلیفہ وقت سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے آپ کو کوئی گزند (۱) نہیں پہنچا سکتا، آپ خلیفہ وقت ہیں آپ کی اطاعت اور ادب ہم پر واجب ہے یہ لڑکا ہے آداب شاہی سے واقف نہیں ہے آپ کا جو دل چاہے کہئے۔

اہل اللہ کی عجیب شان

صاحبو! آپ نے سنا! یہ ہوتی ہے ان حضرات کی شان۔ دنیا دار اگر اطاعت کرتے بھی ہیں تو اسی وقت تک اطاعت کرتے ہیں کہ اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے ورنہ اطاعت اور فرمانبرداری سب ختم ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کی یہ حالت ہے کہ گو سب کچھ کر سکتے ہوں مگر کچھ نہیں کرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''اطیعوا اذا امرکم'' ان حضرات کی جو بات بھی ہوگی پائیدار ہوگی اس لیے کہ یہ پورے شفیق اور سچے رفیق ہیں۔ اس سے زیادہ کیا شفقت ہوگی کہ شیر کو مٹا رہے ہیں اور بادشاہ کو خبر بھی نہیں کرتے اس لیے کہ مقصود اس کے ساتھ ہمدردی کرنے سے خدا کو خوش کرنا ہے۔

حضرت مجدد صاحبؒ کی حکایت لکھی ہے آپ کے زمانہ میں ایک شیخ تھے آپ کو مکشوف ہوا (۲) کہ ان کا نام خدا تعالیٰ کے یہاں اشقیا (۳) میں لکھا ہوا ہے تو باوجود یکہ ہم عصری میں ایک قسم کی منافست ہوتی ہے لیکن آپ نے ان کو اطلاع کیے بغیر برابر ان کے لیے دعا کی کہ اے خدا ان کا نام اشقیاء سے محو کر کے سعداء (۴) کی فہرست میں لکھ دیجئے۔ دیکھئے ان بزرگ کے ساتھ کتنی بڑی ہمدردی کی لیکن ان کو خبر بھی نہیں ہونے دی، نہ ہم عصر کی وجہ سے آپ کے قلب میں کسی قسم کی منافست (۵) کی شان پیدا ہوئی۔ بعض لوگ شیخ نہیں ہوتے مگر وہ دعویٰ مشیخیت کا کرتے ہیں اور ان کو اہل حق سے کشیدگی ہوتی ہے اور

(۱) نقصان (۲) بذریعہ کشف معلوم ہوا (۳) بدبختوں میں (۴) بدبختوں سے کاٹ کر نیک بختوں کی فہرست میں لکھ دیجئے (۵) سبقت کرنے کی۔

ہونا عجب بھی نہیں کیونکہ یہ حضرات خلیفہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اہل باطل کو عداوت ہوتی رہی ان کے ساتھ بھی اہل باطل کو پرخاش ہونی چاہیے۔ محققین نے اس کو علامات کمال میں سے لکھا ہے۔

بزرگی کی علامت

حضرت سلطان جی(۱) کے زمانے میں ایک بزرگ تھے ان پر اتفاق سے ایسا افلاس آیا کہ تمام مال ومتاع ختم ہوکر صرف ایک لونڈی رہ گئی جب اس لونڈی نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں تو ان سے عرض کیا کہ اب مجھے بیچ دیجئے۔ آخر میں کس کام کی ہوں۔ گو یہ ضرور ہے کہ

ترا بندہ چوں من بیفتند بسے مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

مگر کسی دیندار کے ہاتھ بیچے گا آپ نے کہا کہ میں تجھے ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا کہ اس سے زیادہ اس وقت کوئی دیندار نہیں۔

یعنی حضرت نظام الدین سلطانؒ جی کے ہاتھ اس نے عرض کیا کہ حضور ہے تو گستاخی لیکن ان بزرگ کی بزرگی میں تو مجھے شبہ ہے کیونکہ بزرگی کی علامت سے یہ بات بھی ہے کہ کوئی نہ کوئی تو اس کو برا کہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ان کو کوئی بھی برا نہیں کہتا۔ افسوس آج کل یہ علامت بزرگی سے سمجھا جاتا ہے کہ جہاں گئے اس رنگ کے ہوگئے کہ ساری دنیا خوش رہے، گنگا پر گئے گنگارام، جمنا پر گئے جمنارام۔ نیز حضرت سلطان جی کے در پر بڑے بڑے اکابر دنیا سلاطین ووزراء تک دست بستہ آتے تھے اس لیے بھی اس کو شبہ ہوا۔ اس موقعہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک وزیر حاضر تھا، کھانے کا وقت آیا، خادم نے کھانا لانے کی اجازت چاہی، وزیر کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر آج مچھلی کے کباب ہوں تو خوب ہو۔ حضرت سلطان جی اس کے خطرے پر مطلع ہوگئے خادم سے فرمایا ذرا ٹھہرو، تھوڑی دیر میں اس نے پھر دریافت کیا آپ نے پھر یہی جواب دیا، حتیٰ کہ کچھ دیر کے بعد ایک شخص ایک خوان میں مچھلی کے کباب لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ مچھلی کے کباب آپ کے لیے لایا ہوں آپ نے دسترخوان

(۱) خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

لگانے کا حکم دیا وزیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا، آپ نے وزیر سے فرمایا، لیجئے مچھلی کے کباب حاضر ہیں مگر ذرا وقت کی گنجائش رکھ کر فرمائش کیا کیجئے۔ غرض آپ کے اندر ایک محبوبیت کی شان تھی۔ ایک حضرت علاؤ الدینؒ تھے کہ گولر کھا کر بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی نہ ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است　　بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست (۱)

ہر ایک کا رنگ و بو الگ ہے کوئی کسی شان کا ہے کوئی کسی شان کا ہے تو حضرت سلطان جی کی یہ حالت تھی کہ آپ کے در پر سب سر نیاز خم کرتے تھے اس لیے اس لونڈی کو آپ کی بزرگی میں شبہ ہوا۔ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ میں تجھے بیع خیار کے طور پر بیچوں گا دو تین دن کے اندر تو ان کی حالت دیکھ لینا پھر اگر تیری مرضی ہوگی تو رہنا ورنہ میں تجھے واپس لے لوں گا۔ غرض آپ نے حضرت سلطان جی کے ہاتھ اس کو فروخت کر دیا وہ چونکہ آپ کی پورے طور پر معتقد نہ تھی اس فکر میں لگی رہی۔ حضرت سلطان جی کو کشف کے ذریعے سے اس کے وسوسہ پر اطلاع ہوگئی آپ نے اس سے فرمایا جا کر پڑوس سے آگ لے آؤ، پڑوسن کے ہاں گئی اور کہا کہ حضرت جی کے ہاں تھوڑی آگ کی ضرورت ہے، پڑوسن نے حضرت کا لفظ سن کر آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور کہا کہ ڈاکو کو حضرت کہتے ہیں! لونڈی یہ سن کر بہت خفا ہوئی اور بگڑ کر واپس چلی آئی۔ حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اب تو معلوم ہو گیا کہ مجھے سب اچھا نہیں سمجھتے، دیکھ میری پڑوسن ہی مجھ کو کیسا برا سمجھتی ہے اس نے کہا کہ حضرت یہ میری جہالت تھی واقعی آپ صاحب کمال ہیں۔ پھر مدت خیار گزرنے کے بعد اس کے پہلے مالک آئے اور آ کر اس سے پوچھا اس نے عرض کیا کہ حضور واقعی یہ بزرگ ہیں اب آپ کو واپس لینے کی ضرورت نہیں۔

کاملین کی حالت

غرض مقبول عام ہونا کوئی بزرگی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عدم کمال کی

(۱) ''پھول کے کان میں کیا کہہ دیا کہ ہنس رہا ہے اور بلبل کو کیا کہہ دیا کہ رو رہی ہے''

علامت ہے۔ کاملین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کو اگر سب بھی برا کہیں تب بھی یہ کسی کو کچھ نہ کہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ان حضرات کو غصہ نہیں آتا، غصہ ضرور آتا ہے مگر وہ غصہ خدا کے لیے ہوتا ہے اپنے نفس کے لیے نہیں ہوتا اپنے نفس کے لیے ان کی وہی حالت ہوتی ہے جس کو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو کہ دس برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے کہ ''ما قال لی قط لما فعلت '' کہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں کام تو نے اس طرح کیوں کرلیا اس طرح کیوں نہیں کیا حتی کہ بوجہ بچپن کے یہ اس قدر بے تکلف تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے کسی جگہ ان کو جانے کو فرمایا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں تو نہیں جاتا مگر دل میں یہ تھا کہ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انکار پر خفا نہیں ہوئے، اگر کوئی کام ان سے بگڑ جاتا تو آپ فرماتے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا مگر ان پر خفا نہ ہوتے تھے۔

معتقد تقدیر کا حال

آج کل کے روشن خیال لوگوں نے مسئلہ تقدیر کو بالکل ہی چھوڑ دیا، کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر ہی سے مسلمانوں کو تنزل (۱) ہو رہا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر ہی کے مسئلے کی بدولت ترقی ہوئی ہے اس سے تنزل (۲) ہرگز نہیں ہوا کیونکہ مدار ترقی کا ہمت پر ہے اور ہمت قائل تقدیر کے برابر کسی کو نہیں ہوسکتی، منکر تقدیر تو فقدان اسباب (۳) کے وقت جی چھوڑ دیتا ہے اور معتقد تقدیر اس وقت بھی خدا تعالیٰ پر نظر کر کے ہمت نہیں ہارتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ

عقل در اسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبب را نگر (۴)

اسی طرح اس شخص کو کوئی پریشانی نہیں ہوسکتی، جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اپنے دل کو یہ سمجھ کر تسلی دے لے گا کہ ''لن یصیبنا الا ما کتب اللّٰہ لنا''(۵) غرض پوری راحت تقدیر ہی کے ماننے سے ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر دو شخص ایسے ہوں کہ تمول (۶)

(۱) مسلمان پستی کا شکار ہیں (۲) پستی ہرگز نہیں ہوئی (۳) اسباب نہ ہونے پر دل ہار جاتا ہے (۴) ''عقل اسباب اور وسائل پر نظر رکھتی ہے مگر عشق و محبت یہ کہتی ہے کہ اسباب کے پیدا کرنے والے کو دیکھ'' (۵) ''ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جسے خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے لکھ دیا ہے'' سورۃ التوبہ: ۵۱ (۶) مالداری۔

میں بھی برابر ہوں، دنیاوی عیش بھی دونوں کو برابر حاصل ہو، عقل اور مزاج اور قوت وغیرہ سب میں یکساں ہوں، دونوں کے ایک بیٹا بھی ہو، غرض ہر طرح کے سامان دونوں میں برابر ہوں کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ ہو مگر اتنا فرق ہو کہ ایک مسئلہ تقدیر کا قائل اور دوسرا منکر ہو اور اتفاق سے ایک ہی تاریخ میں ان دونوں کی اولاد مر جائے اور فرض کیجئے کہ ان کے مرنے کا ظاہری سبب یہ ہوا ہو کہ دونوں کی بیماری کی تشخیص ہونے میں اور علاج میں غلطی ہوگئی تھی، تو اب بتلایئے کہ ان میں سے کس کا صدمہ جلدی ختم ہوگا اور کس کا صدمہ دیر پا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جو تقدیر کا قائل ہے اس کو بہت جلد راحت نصیب ہوجائے گی کیونکہ صدمہ پڑتے ہی اس کو یہ خیال ہوگا کہ ''ما اصاب من مصیبة إلا بإذن اللّٰه ''(۱) کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ نیز اس کو فوراً خیال ہوگا کہ ممکن ہے اس کی موت ہی میں کوئی مصلحت ہو۔ ان خیالات کے آتے ہی اس کا صدمہ ختم ہوجائے گا۔ برخلاف منکر تقدیر کے اس کو ساری عمر یہ غم لگا رہے گا، کبھی سوچے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر نہ کی ورنہ ضرور میں کامیاب ہوتا اور لڑکا بچ جاتا، کبھی کہے گا کہ فلاں بدپرہیزی نہ کی جاتی تو ہرگز نہ مرتا۔ غرض اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں تمام عمر غلطاں پیچاں (۲) رہے گا۔ اب میں پوچھتا ہوں عقلاء زمان! بتلایئے کہ اس موقع پر پریشانی کا دفع کرنا اور راحت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں، اگر ضروری ہے تو ذرا مہربانی کرکے بتلا دیجئے کہ سوائے مسئلہ تقدیر کے ماننے کے اور کون سی ایسی صورت ہے کہ اس شخص کی پریشانیاں دور کردی جائیں اور اسے راحت نصیب ہوجائے۔ افسوس شریعت نے کتنا پاکیزہ مسئلہ ہم کو دیا اور ہم نے اس کی یہ قدر کی۔ ہماری وہ حالت ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ (۳)

شدت وحی کا عالم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ۲۳ برس تک وحی کا بوجھ اٹھا اٹھا کر اس کی سختیاں برداشت کرکے ہم کو زر و جواہر دیئے اور ہم نے سنگریزوں (۴) کی طرح ان کی ناقدری کی۔ وحی

(۱) ''جو کچھ بھی پہنچی تم کو مصیبت میں سے بس وہ خدا کی اجازت سے پہنچی ہے'' سورۃ التغابن: ۱۱ (۲) ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا (۳) کسی سے کوئی کام کی بات کی جائے اور وہ بے تکی باتیں بنانے لگے تو یہ محاورہ بولتے ہیں (۴) معمولی پتھروں کی طرح۔

کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی ران پر زانوں رکھے بیٹھے تھے، اس وقت وحی نازل ہوئی، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ''کادان ترخی فخذی'' یعنی کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران پاش پاش ہوجائے گی۔ ایک مرتبہ آپ اونٹنی کے اوپر سوار تھے۔ اسی حالت میں وحی نازل ہوئی اس قدر شدت تھی کہ اونٹنی سہار(۱) نہ سکی او ربیٹھ گئی۔ غرض کتنی تکالیف برداشت کرکے عالم غیب سے فیوض لیے اور آپ کو مفت دیئے۔ گویا تخم ریزی کی(۲)، کھیت کاٹا، آٹا بنایا، پکایا اور لقمہ تیار کرکے آپ کے منہ میں رکھ دیا مگر آپ ہیں کہ اس کو منہ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ صاحبو! اگر قیامت میں نبی کریم ﷺ نے اتنا ہی دریافت فرمالیا کہ میرے احکام کی تم نے کیا قدر کی تو بتلاؤ تم کیا جواب دوگے۔ یہ سب بیچ کے مضامین استطرادی تھے(۳) بمناسبت مضمون شفقت کے ان کا ذکر آ گیا۔

اصل مقصود

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور ﷺ کو چونکہ کفار بہت ستاتے تھے (اور جب آج کل مدعیان موافقت ہی طرح طرح سے حضور ﷺ کی روح مبارک کو صدمہ دیتے ہیں تو وہ لوگ تو کافر تھے آپ کو مانتے بھی نہ تھے، جتنا ستاتے کم تھا) اور آپ غایت شفقت رکھتے تھے تو آپ کو ان کی مخالفتوں سے بہت غم ہوتا تھا اور ان کے مآل کو(۴) سوچ کر بہت کڑھتے تھے اور چونکہ واقعات بہت زیادہ تھے جن کی وجہ سے غم بھی بہت زیادہ ہوگیا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے جا بجا آپ ﷺ کی تسلی فرمائی ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو تلاوت کیا گیا۔ چنانچہ اسی کی تمہید وتائید میں اس آیت سے پہلے فرماتے ہیں: اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ(۵) یعنی آپ کے انذار سے منتفع ہونے(۶) کے لیے یہ شرط ہے کہ قلب میں خشیت ہو(۷) اور خدا کی اطاعت ہو اور یہ اس سے معرا ہیں(۸) اور آگے فرماتے ہیں:

(۱) برداشت نہ کرسکی (۲) بیج بویا (۳) یہ سب مضامین ضمنی تھے شفقت کی مناسبت سے ذکر کردئے گئے (۴) انجام (۵) ''آپ ان لوگوں کو ڈراتے ہیں جو اپنے پروردگار سے غائبانہ طور پر ڈرتے ہیں اور نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں'' سورۃ الفاطر: ۱۸ (۶) آپ کے ڈرانے سے فائدہ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے (۷) خوف خدا ہو (۸) خالی ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۱) کہ اندھے اور بینا، تاریکی اور نور، سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہوسکتی تو یہ لوگ تو اندھے ہیں اور ان کے قلب (۲) تاریک محض ہیں پھر یہ کیونکر منتفع ہوسکتے (۳) پھر آپ ان کے حالات سے غمگین کیوں ہوتے ہیں، آگے ارشاد ہے: ''إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ'' (۴) کہ خدا جس کو چاہیں سنا دیں آپ ان لوگوں کو جو کہ بے حسی میں مثل مردوں کے ہیں، نہیں سنا سکتے۔ (آپ اس غم میں نہ پڑیں) آپ تو ایک نذیر ہیں۔ آگے فرماتے ہیں ''أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ'' (۵) حاصل یہ کہ جس طرح ثمرات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اعیان بھی مختلف ہیں۔ آگے ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ (۶) کہ انسانوں میں چوپاؤں میں سب میں مختلف طرح کے ہوتے ہیں پھر اگر یہ لوگ بھی اسی طور (۷) کے ہوگئے تو تعجب کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۸) یعنی اوپر معلوم ہوا ہے ''إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ'' الخ کہ انذار سے انتفاء موقوف ہے خشیت پر (۹) اور یہاں فرماتے ہیں کہ خشیت ان لوگوں میں ہوگی کہ جن لوگوں میں علم ہو۔

غم کی حد

خلاصہ یہ ہوا آپ کے انذار سے وہ منتفع (۱۰) ہوسکتا ہے جس میں خشیت ہو (۱۱)

(۱) ''اور نہیں برابر ہوسکتے اندھے اور دیکھنے والے'' سورۃ الفاطر: ۱۹ (۲) دل (۳) فائدہ اٹھاسکتے ہیں (۴) ''بیشک خدا تعالیٰ سناتے ہیں جس کو چاہتے ہیں اور آپ نہیں سناسکتے ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں، نہیں ہیں آپ مگر ڈرانے والے'' سورۃ الفاطر: ۲۲۔ ۲۳ (۵) ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی۔ پس نکالا ہم نے اس کے ذریعہ سے رنگ برنگ کے پھل اور پہاڑوں سے چکنے سفید اور سرخ پتھر جن کے رنگ ہیں اور انوکھے نایاب سیاہ پتھر'' سورۃ الفاطر: ۲۷ (۶) ''لوگوں میں سے (انسان) چوپاؤں اور جانوروں میں سے ان کا رنگ بھی اسی طرح مختلف ہوتا ہے'' سورۃ الفاطر: ۲۸ (۷) طرح (۸) ''بیشک اس کے بندوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہیں'' سورۃ الفاطر: ۲۸ (۹) حضور ﷺ کے ڈرانے سے فائدہ جب ہی ہوگا کہ دل میں خوف خدا ہو (۱۰) فائدہ اٹھاسکتا ہے (۱۱) خوف۔

اور خشیت ان میں ہوگی کہ جن میں علم ہو تو آپ کے انذار سے منتفع وہ لوگ ہونگے جن میں علم ہو کیسی کامل تسلی فرمائی اور منتہا کیسی اچھی چیز پر رکھا کہ وہ محسوس ہے تا کہ آپ کی پوری پوری تسلی ہوجائے کہ جہاں آپ علم دیکھیں وہاں اہتمام بھی کریں اور جہاں یہ نہ ہو وہاں غم نہ اُٹھائیں اور اس آیت سے کئی فائدے معلوم ہوئے۔ ایک تو یہ کہ علماء کو چاہیے کہ وہ ایسوں پر بھی شفقت کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ غم کی بھی ایک حد ہونا چاہیے کہ اس حد سے آگے نہ بڑھا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو قوی تھے ہم ضعیف ہیں اگر غم کا زیادہ بار ہم پر پڑے گا تو اندیشہ ہے کہ ہم کو مالیخولیا(۱) نہ ہوجائے تو ایسے لوگوں کے لیے زیادہ اہتمام کے بھی درپے نہ ہوں۔ یہ شریعت کی خوبی ہے کہ اس نے افعال حسنہ اور اخلاق حسنہ کی بھی حدود مقرر کردیں کہ ان سے آگے نہ بڑھا جائے میں اس کی کچھ تفصیل کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرماتے ہیں ''اسئلك من خشيتك ماتحول به بيننا وبين معاصيك ''(۲) اور یہ اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آج کل کے عقلاء معلوم کرلیں کہ تعلیم محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر غامض ہے(۳) کہ کوئی پہلو اس میں چھوڑا نہیں گیا۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس کے قائل ہیں اگر منکر ہوتے تو ہمارے سامنے اس کا بیان کرنا ضروری تھا تو میں کہوں گا کہ حضور اگر قائل ہو اور واقعی دل سے یہ کہتے ہو تو پھر احکام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دخل کیوں دیتے ہو اور اگر تم کو کسی حکم کی حکمت نہیں معلوم ہوتی تو اس کو خاموشی کے ساتھ مان کیوں نہیں لیتے۔ آج کل ایسے تو کم ہیں کہ وہ یوں کہہ دیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں مانتے مگر ایک اور غلطی میں مبتلا ہیں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم پُر حکمت ہے اور فلاں حکم میں کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں بلکہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے اور یہ مرض اس زمانے میں بھی تھا کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ آپ کا تراشا ہوا ہے چونکہ یہ تکذیب آیات کی تھی آپ کو اس سے حزن ہوتا تھا۔

---

(۱) پاگل پن نہ طاری ہوجائے (۲) ''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے ایسے خوف کی جو ہمارے اور آپ کی نافرمانی کے درمیان حائل ہوجائے'' (۳) گہری ہے۔

سبب محزن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس پر یہ آیت تسلی کے لیے نازل ہوئی ''قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ''(۱) اس کی مشہور تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ ان کے اقوال سے مغموم ہوتے ہیں سو آپ کیوں غم کرتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے یہ تو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال سے رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے کہ آپ اس پر صبر کرلیں بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں جس پر آپ کو صبر ہو ہی نہیں سکتا اور اس کو کوئی تفسیر بالرائے نہ سمجھے کیونکہ تفسیر بالرائے وہ ہے کہ جو قاعدہ شرعیہ وقواعد عربیہ کے خلاف ہو اور یہ تفسیر نہ قواعد عربی کے خلاف نہ شرعیہ کے، یہ مضمون کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی برائی سننا اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا جتنا خدا کی برائی سننا خود حدیث سے ثابت ہے۔ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مذمم رکھا تھا اور یہی نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا کہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی ناگوار نہیں ہوا بلکہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''انظروا کیف صرف اللّٰہ عنی شتم قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد''(۲) (نعوذ باللہ) اور خدا کو برا کہنے میں کبھی آپ نے اس قسم کی توجیہ نہیں کی بلکہ آپ کو سخت ناگوار گزرتا تھا چاہے جس انداز سے بھی وہ برا کہتے۔

مثال تفسیر بالرائے

تفسیر بالرائے کی مثال میں آپ کو بتلاتا ہوں آج کل کے روشن دماغوں میں سے ایک صاحب نے ربوا کو حلال لکھا اور فرمایا کہ ''احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا''(۳)

---

(۱) ''تحقیق کہ ہم جانتے ہیں کہ بے شک وہ آپ کو رنجیدہ کرے گا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں پس بیشک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن بیشک (یہ) ظالم ہیں خدائے تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں''(۲) ''دیکھو کس طرح پھر دیا خدا تعالیٰ نے قریش کی گالیوں کو جو گالیاں دیتے برائی کئے ہوئے کو اور لعنت بھیجتے ہیں برائی کیے ہوئے (محمد) کو حالانکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں (کفار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بجائے محمد (تعریف کیے ہوئے) مذمم (برائی کیے ہوئے) کہا کرتے تھے''(۳) ''اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کردیا ہے''

میں یہ لفظ ربوا نہیں بلکہ ربا بضم الرائے جس کے معنی ہیں اچکنے کے۔ گویا یہ فارسی کے مصدر ربودن سے ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اعراب تو قرآن پر تھے نہیں بعد میں مولویوں نے جو چاہا اعراب لگا دیا۔ غرض قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنج اس واسطے ہوا تھا کہ وہ لوگ خدا کو برا بھلا کہتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا کہتے تو آپ کو اس قدر ناگوار نہ ہوتا۔ اسی طرح ہم لوگ بھی خوش ہیں کہ آج کل کے روشن دماغ جو کچھ الزام لگاتے ہیں ہم ہی پر لگاتے ہیں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ نہیں کہتے مگر ان پر اتنا افسوس ہے کہ انہوں نے محض اس وجہ سے کہ کسی قول میں ان کو کوئی حکمت معلوم نہیں ہوئی اس قول کے قول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا انکار کر دیا۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ صاحبو! کیا تمہاری عقل تمام حکم کو حاوی ہوگئی ہے ہرگز نہیں، جب یہ ہے تو بس تمہاری یہ حالت ہونی چاہیے کہ:

زباں تازہ کردن باقرارتو نیندیختن علت ازکار تو(۱)

علماء کو وصیت

اور اگر عقل سے کام لو تو صاف طور سے معلوم ہو جائے کہ علماء سے جو یہ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے یہ سراسر غلطی ہے اور علماء کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ شفقت کر کے جواب کی مصیبت میں نہ پڑیں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی جج کے یہاں آپ کا کوئی مقدمہ ہو اور وہ کسی قانون کی رو سے اس مقدمہ کو خارج کر دے تو کیا آپ اس کے بنگلے پر پہنچ کر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس قانون کے تقرر میں کیا حکمت ہے اور اگر آپ دریافت کریں تو کیا جج کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کو اس قانون کی حکمت بتلائے اور سمجھا دے کہ یہ وجہ ہے اگر کہئے کہ ضروری ہے تو میں آپ کو قوانین کے متعلق چند سوالات دیتا ہوں ذرا مہربانی فرما کر ان کی حکمت جج صاحب سے لکھوا لائیے اور اگر کہئے کہ اس کے ذمہ ضروری نہیں کیونکہ وہ عالم قانون ہے واضع قانون نہیں (۲) اور حکمت بتلانا واضع قانون کا منصب ہے (۳) تو میں کہتا ہوں کہ علماء بھی تو عالم قانون

(۱) ''زباں تیرے اقرار سے تروتازہ کرتا ہوں اس کام کی حکمت کیا ہے اس سے مجھے سروکار نہیں'' (۲) قانون جاننے والا ہے بنانے والا نہیں (۳) قانون بنانے والے کے ذمہ ہے۔

ہیں واضع قانون نہیں پھر ان سے کیوں قوانین شرعیہ کی حکمتیں دریافت کی جاتی ہیں اور ان کا انکار زبردستی کا جواب کیوں سمجھا جاتا ہے اور اگر ان کا انکار زبردستی کا جواب ہے تو کیا وجہ ہے؟ جج صاحب کا انکار زبردستی کا جواب نہیں سمجھا جاتا، ایک جج کے جواب کی وقعت کے برابر علمائے اُمت کے جوابوں کی قدر نہیں۔

بانی اسلام صرف خدا ہے

اور علماء تو کیا واضع قانون ہوتے خود ہمارے حضور کریم ﷺ بھی واضع (۱) وبانی قانون نہیں ہیں صرف عالم وحاکم بالقانون (۲) ہیں اور یہیں سے مسلمانوں کی ایک اور غلطی بتلاتا ہوں کہ اکثر مسلمان حضور ﷺ کو بانی اسلام کے لقب سے ملقب کرتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ یہ لقب عیسائیوں نے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے احکام کو آپ کا تجویز کردہ کہتے ہیں مگر مسلمانوں نے محض تقلیداً یہ لفظ اختیار کرلیا۔ صاحبو! یاد رکھو بانی اسلام صرف خدا ہے حضور ﷺ کی وہ حالت ہے کہ:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم (۳)

شان رسول اکرم ﷺ

مولانا فرماتے ہیں کہ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود (۴)

تو آپ کا ارشاد خدا کا ارشاد ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ط اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ''(۵) اور اس سے اجتہاد کی نفی نہیں ہوتی آپ اجتہاد فرماتے تھے مگر وہ بھی جب کہ وحی اس کی تائید کرتی یا وحی اس پر سکوت کرتی حکم میں وحی کے ہوجاتا تھا کہ اس

(۱) بنانے والے (۲) قانون جاننے والے اور حکم دینے والے (۳) ''میں تو پس آئینہ بولنے والے پرندے کی مانند ہوں جو کچھ اللہ نے کہا ہے وہی بیان کرتا ہوں'' (۴) ''ان کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا ہے اگرچہ عبداللہ (محمد ﷺ) کی زبان مبارک سے نکلے'' (۵) ''وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے وہ تو وحی من جانب اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجی گئی'' سورۃ النجم: ۳۔۴

کا منکر بھی ویسا ہی کافر تھا جیسے وحی صریح کا منکر آپ ﷺ کی شان بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں بانسری ہو اور وہ اس کو بجا رہا ہو تو ظاہر میں جو کچھ آواز نکلتی ہے بانسری سے نکلتی ہے ناواقف یہی سمجھتا ہے کہ یہ بانسری بول رہی ہے لیکن جو جاننے والا ہے وہ جانتا ہے کہ بانسری کے ایک دوسرا منہ بھی ہے جو بجانے والے کے منہ سے ملا ہے یہ بجانے والے کی آواز ہے جو کہ اس منہ سے ہو کر بانسری میں آرہی ہے اور بانسری سے ظاہر ہو رہی ہے اسی شان کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

دو دہاں داریم گویا ہمچونے یک دہاں پنہانست درلبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے وہوئے درافگندہ درسما(۱)

اور لیجئے شجرہ وادی ایمن نے انی انا اللّٰہ (۲) کہا تھا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ آواز شجرہ (۳) کی تھی ہرگز نہیں بولنے والا کوئی دوسرا ہی تھا شجرہ محض مظہر تھا (۴) تو جب شجرہ سے کلام خداوندی نے ظہور کیا تو اگر حضور ﷺ کی زبان فیض ترجمان سے کلام خداوندی کا ظہور ہو تو کیا تعجب ہے اور جب یہ بات ہے تو حضور ﷺ بانی اسلام کہاں سے ہوئے مگر ہمارا مذاق کچھ ایسا بگڑا ہے کہ ہم نے اپنے گھر کی سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے اور غیر قوموں کی ہر چیز کو اختیار کر لیا اگرچہ وہ ہم کو اور ہمارے مذہب کو مضر ہی ہو (۵)۔ چنانچہ بانی اسلام کا لقب عیسائیوں نے اپنے انکار کی وجہ سے دیا تو ہم نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ علیٰ ہذا معاشرت کہ اس کا ہر ہر پہلو ہم نے غیروں سے لے رکھا ہے وہی بات جو کل علماء کہتے تھے اور اس کو خاطر میں نہ لایا جاتا تھا اگر دوسری قومیں کرنے لگیں اس کی ضرورت ان کو بھی محسوس ہونے لگی۔

حضرات علماء کا نان ونفقہ

چنانچہ علماء نے مدت تک نہایت شدومد کے ساتھ کہا کہ علماء کی ایک ایسی

(۱) ”میں بانسری کی طرح دو منہ رکھتا ہوں ایک منہ بجانے والے کے منہ میں چھپا ہوا ہے، دوسرے منہ سے فریاد جاری ہے جو زمانے میں پھیل رہی ہے“ (۲) کوہ طور پر درخت سے آواز آئی میں اللہ ہوں (۳) درخت کی آواز تھی (۴) درخت سے تو صرف آواز نکل رہی تھی (۵) نقصان دہ۔

جماعت ہونی چاہیے کہ وہ صرف خدمت دین کا کام کریں، دوسرا کوئی کام ان کے سپرد نہ ہوتو علماء پر اعتراض کیا جاتا تھا اور سوال کیا جاتا تھا آخر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے حالانکہ یہ اعتراض واقع میں اپنے اوپر تھا نہ کہ علماء پر۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد(۱)

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے نکاح کیا اور نکاح کرنے کے بعد بیوی کے پاس جا کر کہنے لگا کہ تم نے نکاح تو کیا لیکن یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ بیوی اس کو کیا جواب دے گی، میاں جب میں تمہارے نکاح میں آ گئی تو میری تمام ضروریات کا تکفل خود بخود تمہارے ذمہ ہوگیا(۲) میں تم سے لے کر کھاؤں گی۔ خلاصہ اس جواب کا یہ ہوا کہ میں چونکہ تمہارے کام میں محبوس ہوں اور محبوس کا نفقہ ''من لہ الحبس''(۳) پر ہوتا ہے اس لیے میرا نفقہ تم پر ہے تو حضرات مدت تک تو مولوی خاموش رہے مگر اب آپ صاف صاف کہلاتے ہیں تو سنئے کہ مولوی آپ کی خدمات میں محبوس ہیں تو باقاعدہ مذکورہ ان کا نفقہ آپ کے ذمہ ہے اور یہ قاعدہ تمدنی بھی ہے شرعی بھی اول شرعی پہلو کو بیان کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ(۴)

دیکھو! لام للفقرآء میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالش(۵) کر کے لے سکتے ہیں۔ گو دنیا میں نالش نہ ہو سکے(۶) لیکن خدا تعالیٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فقراء ذکر فرمایا ہے۔ فقیر آج کل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے

(۱) ''اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اے بھولے مرد اس شیر کی طرح جو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے''(۲) میری تمام تر ذمہ داریوں کے تم کفیل ہو(۳) جو شخص کسی کے کام کرنے میں مشغول ہو اس کا خرچہ اس کے ذمہ ہوتا ہے جس کے کام میں یہ لگا ہوا ہے(۴) ''اس میں حق ہے ان فقراء کا جو کہ اللہ کے راستے میں کھڑے ہوئے ہیں، زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جاہل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے'' سورۃ البقرۃ: ۲۷۳ (۵) مقدمہ کر کے اپنا حق وصول کرلیں (۶) مقدمہ قائم نہ ہو سکے۔

مگر یہ ذلت اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نا معقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہی لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لیے فرماتے ہیں: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ(۱) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم(۲)

علماء امور دین میں وقف ہیں

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ ''لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ'' یہ وہی بات ہے جس کو آپ بروئے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہوجاتے ہیں۔ صاحب! بے شک! اپاہج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں۔ اس مسئلے کو میں ایک مثال دے کر زیادہ واضح کرتا ہوں ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو کہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبع کرلیا، شدہ شدہ(۳) حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانہ آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبع بند کردو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ؟ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اب تو غالباً تسکین ہوگئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں۔

حقیقت تنخواہ

بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ واقع میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے چن چن کر جمع کیا جاتا ہے۔ کسی عورت

(۱) ''اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو'' سورۃ فاطر: ۱۵ (۲) ''ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیمانہ میں مست ہیں'' (۳) آہستہ آہستہ۔

نے پوچھا تھا عورت سے فوج کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں بس یہی فوج ہے۔ تو آپ کا پیسہ ان کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے۔ اس کو سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قومی کاموں میں مصروف ہے کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتی اس لیے قوم کے مجموعہ مال (۱) میں سے اس کو نفقہ دیا جاتا ہے (۲) اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہوگیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے (۳) تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہنچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہا ہے۔ اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں دست سلطان (۴) کی آڑ میں آ گیا ہے اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی کو علماء مدت تک کہتے رہے مگر چونکہ دوسری قوموں نے اس کو شروع نہ کیا تھا جیسے عیسائیوں کا مشن کہ ان کا خلاصہ یہی ہے تو ہمارے مسلمانوں کو خبر نہ تھی اور سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ اب جبکہ ایک دوسری ہمسایہ قوم اٹھی اور اس نے جا بجا گروکل (۵) قائم کیے اور ایک جماعت کی جماعت کو اپنے مذہب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تو اب بعض بعض مسلمانوں کو جنبش ہوئی (۶) کہ جب ہندوؤں نے اس کام کو کیا تو یہ کام بیشک ضروری ہے۔ افسوس ہے تعلیم قرآن محرک نہ ہوئی، تعلیم حدیث سے جنبش نہ ہوئی، اقوال علماء سے ہوش نہ آیا، حرکت ہوئی تو برادران وطن کی مثال دیکھ کر۔

خوف میں اعتدال

بات بھی دور پہنچ گئی، میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب صاحب جج کے اس جواب سے کہ ہم عالم قانون ہیں ہم سے حکمت کا سوال نہیں ہوسکتا، تسلی ہوجاتی تو کیا وجہ کہ اقوال علماء سے تسلی نہیں ہوتی اور ان کو زبردستی کا جواب کہا جاتا ہے اور ان کو عاجز سمجھا جاتا ہے

(۱) یعنی بیت المال (۲) خرچہ (۳) اسی لیے منبر قومی اسمبلی کو عوامی نمائندہ کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کا نائب ہے (۴) ایک پردے میں کہ جو بادشاہ کا ہاتھ ہے اس کی آڑ میں ہے (۵) عبادت خانے (۶) تحریک ہوئی۔

کیا ایسے منہ سے نکلی ہوئی بات کہ وہ لا الٰہ الا اللہ سے بھی آشنا نہ ہو باوقعت سمجھی جائے اور وارثان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو عجز پر محمول کرنا فساد مذاق نہیں ہے۔ اب علماء کو بھی چاہیے کہ وہ ضابطہ پر رہیں اور کہہ دیں کہ خدا سے پوچھو وہی واضع قانون ہیں (۱)۔ بس سنار کی کھٹ کھٹ سے یہ لوہار کی ایک بہت اچھی ہے۔ غرض یہ معلوم ہوگیا کہ گو قانون کی حکمت نہ بتلائی جائے مگر کوئی قانون ایسا نہیں کہ وہ پر حکمت نہ ہو اسی لیے میں یہ نظیریں بتلاتا ہوں کہ جہاں حکمت معلوم نہ ہو وہاں یہ نہ سمجھو کہ حکمت نہیں ہے سو وہ نظیر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:'' اسئلك من خشيتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك ''(۲) صاحبو! غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خوف مانگتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قید لگادی ہے کہ خوف اس قدر ہو کہ گناہ نہ ہونے دے اس میں حکمت یہ ہے کہ خوف جب حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو موجب تعطل ہوجاتا ہے (۳) اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ دیکھئے ہم لوگ پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں مگر سمجھتے وہی لوگ ہیں جن کی شان یہ ہے :

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید واوستا(۴)

کہ ان کے اندر وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم انبیاء بھرے ہیں۔ چنانچہ الحمد للہ میں بھی انہی کی تقلید کرکے کہتا ہوں کہ شدت خوف سے امور معاش اور امور دین سب معطل ہوجاتے ہیں (۵) اس میں راز یہ ہے کہ جب کوئی چیز حد اعتدال سے بڑھتی ہے تو اول اس کا اثر مباحات (۶) پر ہوتا ہے کہ ان کو ترک کراتی ہے پھر جب اور غلبہ ہوتا ہے تو واجبات تک نوبت آتی ہے پھر جب بالکل ہی انتہا ہوجاتی ہے تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ میں اس قدر گنہگار ایسا شریر ہوں تو میری مغفرت کس طرح ہوسکتی ہے؟ اور جب مغفرت نہیں ہوسکتی تو کیوں بلاوجہ مصیبت بھروں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کہتے تھے کہ دوزخ تو میرے لیے ضرور ہی لکھی ہے پھر نفس کے حظوظ

(۱) قانون بنانے والا (۲) '' میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ کے ایسے خوف کا جو حائل بنے ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان'' (۳) بے کار کردیتا ہے (۴) '' اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم دیکھتا ہے بغیر کتاب بغیر معاون اور بغیر استاد کے'' (۵) دین ودنیا کے سب کاموں میں خلل پڑتا ہے (۶) جائز امور

میں کیوں کسر رکھوں۔ چنانچہ انہوں نے اس قدر ظلم کیے کہ کچھ انتہا ہی نہیں چھوڑی۔ پس جب اس مقام کا خاصہ تغطل ہے(۱) اور وہ غیر محدود ہے تو اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اے خدا مجھے اتنا خوف دے کہ وہ گناہوں سے بچائے۔

اخلاق حسنہ کی حد

صاحبو! کیا کوئی بتلاسکتا ہے کہ کسی نے اخلاق حسنہ کی حد بتلائی ہو اور فرماتے ہیں کہ مجھے شوق دے لیکن ''من غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة''(۲) کہ وہ شوق اتنا نہ ہو کہ میرے جسم کو ضرر دے یا میرے لیے مؤجب فتنہ ہوجائے کیونکہ شوق کا خاصہ یہ ہے کہ اول جب اس کی شدت ہوتی ہے تو اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے کہ سوزش قلب پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور قوی مختل ہونے(۳) لگتے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات ضروری عبادات ترک ہونے لگتی ہیں۔ دوسرے ضرر اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب شوق بہت بڑھتا ہے تو اس سے ناز کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور ہیبت خداوندی کم ہوجاتی ہے اور گستاخانہ کلمات زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ناز کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوئی مگرد(۴)

حضور ﷺ نے دونوں کا علاج کیا کہ نہ مجھے اس سے ضرر ظاہری ہو اور نہ ضرر باطنی۔

حد شکن لوگ

جب معلوم ہوا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے تو شفقت کی بھی ایک حد ہونی چاہیے آج کل حد شکن دو قسم کے لوگ ہیں ایک اہل دنیا کہ وہ بھی حد شکنی کرتے ہیں(۵) اور دوسرے اہل دین کہ وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اہل دنیا کی حد شکنی تو یہ ہے کہ وہ قوم پر ایسی شفقت کرتے ہیں کہ اس میں دین کا بھی ضرر ہوجاتا ہے بلکہ اکثروں کا تو نصف محض قوم ہوگئی ہے وہ اگر ہمدردی بھی کرتے ہیں تو اس لیے کہ یہ ہماری قوم ہے

(۱) اس درجہ پر پہنچ کر آدمی بیکار ہوجاتا ہے (۲) ''بغیر کسی نقصان پہنچانے والے کے نقصان کے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنے سے'' (۳) اعضاء میں خلل آتا ہے (۴) ''ناز کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تم یہ رکھتے ہو تو بدخوئی کے پاس نہ پھٹکو'' (۵) حدود سے تجاوز کرنے والے۔

اس سے ہمدردی کرنا ضروری ہے اور مذہب پر بھی قائم ہیں تو محض اس لیے کہ دنیا کی اقوام ترقی کر رہی ہیں تو ہم کو بھی ترقی کرنی چاہیے اور ترقی بدوں اتفاق کے ممکن نہیں اور اتفاق بدوں اتحاد مذہب کے ہو نہیں سکتا تو ہم کو مجبوراً ایک مذہب پر رہنا چاہیے بلکہ دوسروں کو اگر تبلیغ اسلام کرتے ہیں تو وہ بھی اس لیے کہ اگر یہ ہمارے مذہب میں آجائیں گے تو گویا ان کے نزدیک اسلام مطلوب لغیرہ ہے(۱) فی نفسہ وہ کوئی قابل طلب چیز نہیں اگر اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ترقی کا ممکن الحصول ہو(۲) تو ان کے نزدیک اس کو چھوڑ دینا بھی گویا کچھ مضر نہیں ہے ورنہ اگر ان کے نزدیک مذہب کوئی قابل وقعت چیز ہے تو کیا وجہ کہ اس کے ایک جزو کو تو لیا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دیا گیا، مطلوب کا ہر جزو مطلوب نہیں ہوتا؟ جب ہوتا ہے تو کیا وجہ کہ حرمت سود کو چھوڑا، نماز کو چھوڑا، صرف ایک اتفاق اور ہمدردی کو لے لیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ قومی چندوں میں ایک ایک روپیہ کو نیلام کیا جاتا ہے اور وہ چار سو پانچ سو کا فروخت ہوتا ہے حالانکہ یہ کھلا ہوا سود ہے صرف ایک قوم کا لفظ یاد کر لیا ہے۔ بس صاحبو! غور تو کرو قوم کی خدمت جو محمود ہے آخر کس لیے اس لیے کہ خدا کا حکم ہے کہ قوم کی خدمت کرو تو جب خدا کو ناراض کر کے تم نے قوم کی خدمت کی تو وہ خدمت محمود کہاں رہی جب خدا ہی سے سلسلہ توڑ دیا تو قوم سے جوڑ کر کیا فلاح ہوگی۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد(۳)

جب خدا سے بیگانگی ہوگئی تو کس کی قوم صاحبو! حضرت نوح علیہ السلام سے زیادہ تو خیر خواہ نہیں بن سکتے پھر دیکھ لیجئے انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ جو خدا کی نافرمان تھی کیا کیا، پھر مرض پر مرض (۴) یہ ہے کہ ان کی فلاح کی صورتیں جو سوچی جاتی ہیں ان کے مدار کے متعلق آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے

(۱) اسلام حصول اتفاق کے لیے مطلوب ہے اپنی ذات کے اعتبار سے مطلوب نہیں (۲) ترقی حاصل کرنا ممکن ہو تو (۳) ''ہزاروں رشتہ دار جو خدا سے بیگانہ ہیں اس ایک شخص پر قربان جو اللہ تعالیٰ سے آشنا ہو'' (۴) سب سے بڑا مرض۔

مراد ہے کیا ان عوام کالانعام (۱) کی اگر ان ہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا اسی لیے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی آج کل علماء پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی، یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔

اتفاق کی دو صورتیں

صاحبو! علماء کب اتفاق سے روکتے ہیں لیکن اتفاق کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ علماء اپنے مرکز سے ہٹیں اور آپ کے مرکز پر آجائیں۔ سو یہ اتفاق تو یقیناً محمود نہیں (۲) ہاں دوسری صورت اتفاق کی کہ علماء اپنے مرکز پر رہیں اور قوم اپنی وہمی ترقیوں اور مضر خیالوں کو چھوڑ کر ان کے مرکز پر آجائیں، بیشک محمود ہے اور اس طرح اتفاق ہونا چاہیے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوم کو جو متفق بنایا جائے گا تو اس اتفاق کے لیے آخر کوئی معیار بھی ہوگا یا نہیں کہ قوم کو اس معیار کی طرف بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ضرور ہوگا اب میں پوچھتا ہوں کہ وہ معیار کیا ہے سو سب جانتے ہیں کہ وہ معیار حق ہے یعنی حق کی طرف قوم کو بلایا جائے گا کہ یہی ایک مامون اور صاف وہموار شاہراہ ہے جس میں نشیب وفراز (۳) کا نام نہیں اس معیار سے الگ جتنا اتفاق پکارتے ہو اسی قدر نفاق بڑھتا ہے اور جب معیار متعین ہو گیا تو دیکھو کہ کون اس معیار پر چل رہا ہے اور کون اس سے علیحدہ ہے جو شخص صحیح معیار پر ہو اس کو مت کہو کہ تو اتفاق کر بلکہ جو اس معیار سے ہٹ گیا ہے اس کو معیار پر لانے کی کوشش کرو اور اس کو اتفاق رائے دو، دیکھو اگر ایک قوم ٹھکانے پر بیٹھی ہو اور ایک دوسری قوم بھٹکتی پھرتی ہو تو کیا تم پہلی جماعت کو مجبور کروگے کہ ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو کر اس بھٹکی ہوئی جماعت کے ساتھ ہو لے یا اس

(۱) کیا جانور کی مانند عوام کی (۲) پسندیدہ نہیں (۳) اتار چڑھاؤ۔

بھٹکی ہوئی جماعت کو ٹھکانے پر لانے کی کوشش کرو گے، پس مولویوں کو اتفاق کی ترغیب دینا اور ان پر نااتفاقی کا الزام لگانا عجیب بات ہے۔ صاحبو! اتفاق تم پیدا کرو کہ جس صحیح مرکز پر وہ ہیں تم بھی اس پر آجاؤ بس اتفاق کی حقیقت یہ ہے۔

زبانی اتفاق

اور جس کو آپ حضرات اتفاق کہہ رہے ہیں وہ محض لفظ ہی ہے معنی نہیں۔ جیسا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میم واؤ ومیم نو تشریف نیست لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یہ الفاظ تو صرف پہچان ظاہری کے لیے ہیں ورنہ ان میں کیا رکھا ہے، نرے الفاظ کا تو وہی حال ہے کہ جیسے ایک بنئے کا کارکن بیٹھا کھاتے میں حساب جوڑ رہا تھا کہ پندرہ کا پانچ ہاتھ لگا ایک اور، ۲۵ کا پانچ اور ہاتھ لگے دو وغیرہ فغیرہ۔ ایک فقیر بھی وہاں بیٹھا تھا اور ان سب حاصلوں کو ساتھ ساتھ جوڑتا جاتا تھا شام تک سینکڑوں تک نوبت پہنچ گئی، اٹھتے وقت سوال کیا، اس نے ناداری کا عذر کیا، سائل نے کہا کہ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ابھی تو میرے سامنے تُو نے سینکڑوں کے حاصل ہونے کا اقرار کیا اس نے کہا بھائی وہ صرف کاغذ میں حاصل ہوئے ہیں واقع میں حاصل نہیں ہوئے۔ جب الفاظ خلاف معنی ہوں تو وہی مثال ہے کہ:

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید وزدرونت ننگ میدارد یزید(۱)

تو جہاں نرے الفاظ ہوں وہاں محض ہاتھ لگنے سے کیا جمع ہوتی ہے تو یہی آج کل کے اتفاق کے معنی رہ گئے ہیں تو ایک شفقت تو یہ ہے کہ غل شور مچا کر دنیا کا بھلا کرلو چاہے دین رہے یا برباد ہو بلکہ اگر مولوی کچھ کہتے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ یہ مذہبی لوگ ہیں یوں ہی کہا کرتے ہیں ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان

(۱) ''اوپر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کافر کی قبر زیورات سے لدی ہوئی ہے اور اندر خدائے تعالیٰ کا غضب بھرا ہوا ہے، باہر تُو یزید کو برا بھلا کہتا ہے اور تیرا باطن یزید کو رسوا کرنے والا ہے''

کے دل میں مذہب کی کچھ وقعت نہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں مذہب کی وقعت کس قدر ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حال

میرے ایک دوست لکھتے ہیں کہ آج یہاں چند عقلاء جمع ہوئے اور اس میں گفتگو ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب کیا ہے۔ بہت سی گفتگو کے بعد اخیر فیصلہ یہ ہوا کہ اصلی سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہ چھوڑا جائے گا اس وقت تک ترقی ناممکن ہے لیکن مجبوری ہے کہ مذہبی ضرورت روکتی ہے۔ صاحبو! کیا تجویز کے بعد یہ لوگ مسلمان رہے؟ افسوس اسلام کو خار راہ(۱) بتایا جائے اور طرہ یہ کہ پھر بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ صاحبو! کیا یہ لوگ اسلامی خیر خواہ ہیں ہاں اسلام بمعنی قوم اگر ہو تو ضرور اسلامی خیر خواہ ہیں اور اسی کو آج کل شفقت سمجھا جاتا ہے مگر یہ شفقت کا ہیضہ ہے کہ ایک بچے کو اس کی ضد پر برابر کھلاتے ہی چلے جاؤ آخر نتیجہ کیا ہوگا یہی کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے گا اور مرجائے گا۔ پس یہ خیر خواہی اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی مگر خود اسلام ہی کی ان کے قلب میں کچھ وقعت نہیں۔ ایک قصہ اور یاد آیا کہ دیوبند میں ایک مسلمان جن پر اس نئی تہذیب کا اثر پڑا تھا کہنے لگے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک ناصح نے ان سے کہا میاں قیامت کے قائل ہونے میں کیا حرج ہے اگر بالفرض تمہارے خیال کے مطابق قیامت نہ ہوئی اور تم اس کے وجود کے معتقد رہے تو تمہارے اس غلط عقیدے کا تم پر کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ باز پرس ہی کرنے والا نہیں اور اگر ہمارے خیال کے مطابق قیامت ہوئی اور تم اس کے منکر ہوئے تو یاد رکھنا بہت جوتیاں لگیں گی۔ یہ جواب اصل میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے جو انہوں نے کسی دہری کو دیا تھا اس کو کسی نے نظم میں کیا ہے:

قال المنجم والطبیب کلاھما   لا تحشر الاجساد قلت الیکما
ان صح قولکما فلست بخسارۃٍ   اوصح قولی فالخسار علیکما(۱)

(۱) راستہ کا کانٹا(۱) ’’نجومی اور طبیب دونوں نے کہا کہ اجسام کو جمع نہ کیا جائے گا (مراد قیامت) میں نے کہا یہ بات تمہاری ہی طرف، اگر تمہارا قول صحیح ہے تو میرا کون نقصان اگر میرا قول صحیح ہوگیا تو تمہارا ہی گھاٹا (نقصان) ہے‘‘

تو ان روشن خیال صاحب نے یہ کہا کہ یہ تو اس کے سامنے کہئے کہ جس کو کچھ احتمال ہو مجھے تو یقین ہے کہ قیامت کوئی چیز نہیں)نعوذ باللہ من شرور انفسنا (حضرات ایسے بہت سے لوگ اس وقت ہم مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کی بدولت پیدا ہوگئے ہیں۔ گو وہ زبان سے صاف انکار نہیں کرتے مگر دل میں محض انکار ہے۔ میرٹھ میں ایک عہدیدار مسلمان کے پاس عید کے دن بہت سے مسلمان ملنے گئے تو وہ عہدیدار صاحب ان لوگوں سے کہتے ہیں آج آپ لوگوں کی عید ہے افسوس ان کو اسلامی عید کا اپنی طرف منسوب ہونا بھی ناگوار ہوا۔ اور لیجئے ایک مسلمان کلکٹر ہوگئے تھے ان کو اسلام سے اس قدر وحشت ہوئی کہ اپنے اصلی نام کو بھی باقی نہ رکھا اس کو کاٹ چھانٹ کر کے انگریزی ناموں کے طرز پر بنایا اور لطف یہ ہے کہ پھر اپنے کو مسلمان بھی کہتے تھے۔

اسلام کا مفہوم

صاحبو! یہ ترقی اسلام کی ترقی تو ہرگز نہیں، اسلام ایسی ترقیوں سے غنی اور بیزار ہے بلکہ سچ پوچھو تو اسلام کی ترقی تو تمہارے صوفی وضع بننے سے بھی نہیں ہوتی۔ جب تک ایمان دل میں پیوست نہ ہوجائے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں'' شهادة ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله ''(۱) اور شہادت میں بشہادت آیات: اذا جائك المنٰفقون الخ''(۲) تو افق قلب ولسان ضروری ہے تو ترقی شہادتیں کی یہ ہوئی کہ وہ دل میں رچ جائے اور یہ حال ہوجائے۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو(۳)

دوسرے حکیم کہتے ہیں:

علم رسمی سر بسر قیل است وقال نے از وکیفیتے حاصل نہ حال(۴)

---

(۱)'' گواہی دینا اس بات کی کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جناب محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں''
(۲)'' جبکہ آتے ہیں آپ کے پاس منافقین'' سورۃ المنافقون:۱ (۳)'' قیل قال (اعتراض وجواب) کو چھوڑ صاحب حال بزرگ بن جا اور بزرگ کامل کے سامنے پامال (اپنے کو عاجز کردے) ہوجا'' (۴)'' رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے''

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت(۱)
ایں ہو سہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت دردلت افزوں کند(۲)
تو ندانی جز یجوز و لا یجوز خود نہ دانی تو کہ حوری یا عجوز(۳)
ایھا القوم الذی فی المدرسہ کل ما حصلتموہ وسوسہ(۴)
علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی(۵)

یہ ہے وہ علم جو قلب کے اندر پہنچ جائے پس ترقی اسلام کی یہ ہے نہ کہ مال ودولت کی ترقی بلکہ اگر ساری دنیا کے مسلمان نادار ہوجائیں اور لنگے زیر لنگے بالا کی(۶) حالت ہوجائے تب بھی اسلام کی ترقی باقی ہے کیونکہ اسلام فٹن اور چوکڑی کا نام نہیں تو یہ جتنی ترقی ہورہی ہے اسلام کی ترقی نہیں ہے۔ البتہ اہل اللہ کا اسلام اب بھی ترقی پر ہے۔ گوان کے پاس ظاہری سامان نہ ہو اس بے سروسامانی میں بھی ان کی یہ حالت ہے۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک وحکم برستارہ کنم(۷)

اور کہتے ہیں کہ

مبیں حقیر گدایاں عشق راکیں قوم شہان بے کمر وخسرودان بے کلہ اند(۸)

حضرات صحابہؓ کا حال

آخر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی حالانکہ وہ حضرات ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بلکہ کنکریوں پر بیٹھے ہوئے سلطنت فارس وروم کا فیصلہ فرماتے تھے مگر کوئی مال ودولت ان کے پاس نہ تھی اور نہ اس کی ہوس تھی اسی لیے ان حضرات کو ثروت

(۱) ''علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کردے'' (۲) ''یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف وعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کردیتا ہے'' (۳) ''تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت'' (۴) ''اے وہ لوگو جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ محض وسوسہ ہے'' (۵) ''سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کار آمد نہیں باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے'' (۶) ایک چادر اوپر اور ایک چادر نیچے (۷) ''شراب خانے کا مجاور ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھ کر فلک پر ناز کرتا ہوں اور سیاروں پر حکومت کرتا ہوں'' (۸) ''عشق حقیقی کے پر چلے کو خیریت جانو کیوں کہ یہ قوم بادشاہ ہیں بغیر کسی سہارا کے ہوں اور بغیر تاج کے بادشاہ ہیں''۔

کے ملنے سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آپ روتے تھے، لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا افسوس ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں پلہ داری کرتے تھے اور آج اس قدر مال ودولت جمع ہے کہ بجز مٹی میں دفن کرنے کے اور کہیں رکھنے کی جگہ نہیں۔ حضرات! اگر وہ اصلی ترقی آپ کو نصیب ہوجائے تو واللہ اس ظاہری نمود کو آپ ہیچ در ہیچ سمجھنے لگیں (۱)۔ آپ کو معلوم ہوا کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی کیا قدر تھی آپ کی ساری عمر دنیا پرستی میں گزری ہے اس لیے آپ کو کچھ خبر نہیں۔

تو نہ دیدی کہے سلیمان را چہ شناسی زبان مرغاں را(۲)

سلطنت کی قیمت

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور تن تنہا رہ جاؤ اور اس وقت تم کو شدت سے پیاس لگے کہ تمہارا دم نکلنے لگے اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور نصف سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لوگے کہ نہیں؟ اس نے کہا میں ضرور خرید لوں گا، پھر ان بزرگ نے کہا کہ اور اگر اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہوجائے اور کسی طرح ادرار نہ ہو(۳) اور ایک شخص اس شرط پر کہ بقیہ نصف سلطنت اس کو دیدو پیشاب اتار دینے کا وعدہ کرے تو تم کیا کروگے؟ اس نے کہا کہ میں بقیہ نصف بھی اس کو دیدوں گا تو ان بزرگ نے کہا کہ آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس کے لیے آپ اس قدر منہمک ہیں، تو ان حضرات کو دنیا کا یہ نرخ معلوم ہے اسی لیے صحابہؓ نے توسیع سلطنت پر بھی دنیا کا کام نہیں کیا وہ کام کیا جس کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے: ”اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ“(۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جو تھا معمولی سے بھی

(۱) سب سے گھٹیا درجہ کی چیز سمجھیں (۲) ”تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا، تو پرندوں کی بولی کو کیسے پہچانے گا“ (۳) کسی طرح پیشاب نہ آئے (۴) ”وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت دیدیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کام کرنے کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے“ سورۃ الحج: ۴۱

کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لڑتے ہیں کہ شیخینؓ نے خلافت لے لی، حضرت علیؓ کو نہ دی، میں کہتا ہوں کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے دعا کیجئے! اگر حضرت علیؓ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت وتعب دین کے لیے اور قلت دنیا کے لیے معلوم ہوچکی تو ان کو کس قدر مزید کلفت ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی۔ ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا، حضرت علیؓ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رنجی ہوئی (۱) اول تو بہت واقعے غلط مشہور ہیں دوسرے جب اتحاد ودوستی ہوتی ہے تو شکر رنجی بھی ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا کہ تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے کہ نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضور کبھی کبھی ہوجاتی ہے مگر پھر اتحاد ہوجاتا ہے، فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائیدار ہے۔ ذوق کہتا ہے:

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی عجیب شان

ایک عربی حکیم لکھتا ہے: ''ویبقی الود ما بقی العتاب'' (اور باقی رہے گی محبت جب تک عتاب باقی رہے گا) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے اور اگر عتاب نہ کیا جائے اور بات کو دل میں رکھا تو تمام عمر بھی دل سے کدورت نہ نکلے اور اگر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہوجاتا ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ جو کہ سب سے زیادہ محبت اور محبوب تھیں وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہارے خوشی اور ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی ہو تو قسم میں ''لا ورب ابراھیم'' (نہیں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم) کہتی ہو اور جب خوش ہوتی ہو تو ''لا ورب محمد'' (نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتی ہیں:

(۱) لڑائی وغیرہ ہوئی۔

''وھل اھجر الا اسمك'' (نہیں چھوڑتی میں لیکن آپ کے نام کو) کہ حضور اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں۔ تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک کا دوسرے پر ناز ہے ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

حضرات صحابہؓ کی عجیب شان

کانپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا انہوں نے وہی تذکرہ چھیڑا اور حدیث پڑھی۔ ''من سب اصحابی فقد سبنی ومن سبنی فقد سب اللّٰہ''(۱) اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہہ دیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہوگئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا، اس حدیث کے یہ معنی نہیں جو آپ نے سمجھے بلکہ اس کے معنی دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لیے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلایئے کہ یہ وعید کس شخص کے لیے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لیے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی یہی کیا جائے گا یا غیروں اور اجانب کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ اجانب کے لیے یہ وعید ہے، پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لیے یہ حکم ہے اس کو سن کر وہ کہنے لگے کہ یہ ذہانت کی باتیں ہیں میں نے کہا کہ صاحب پھر کیا غباوت کی باتیں کہوں اس پر وہ شرمندہ سے ہوگئے تو مجھے بہت حجاب ہوا۔ اسی لیے میں نے اپنا یہ معمول کرلیا ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی مجھے بلاتا ہے تو اول یہ شرط کرلیتا ہوں کہ خلوت میں گفتگو کروں گا کیونکہ جلوت میں گفتگو کرنے سے اکثر مخاطب لاجواب ہوکر شرمندہ ہوجاتا ہے اور میں

(۱) ''جس نے صحابہ کو گالی دی پس تحقیق کہ اس نے مجھ کو گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی پس تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی'' الکامل لابن عدی: ۴/ ۱۵۲۶

اس کو باوجاہت لوگوں کے لیے پسند نہیں کرتا۔ آخر میں ان کی شرم یوں اتاری کہ میں نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے آپ عامل ہیں مجھ کو نیند کم آتی ہے اگر آپ پانی پڑھ کر بھیج دیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ وہ اس سے خوش ہوئے اور تشتری لکھ دینے کا وعدہ کیا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف داری کر کے دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو برا نہ کہنا چاہیے اور صاحبو! اس وقت کی سلطنت ہی کیا تھی جس پر کوئی لالچ کرتا اس وقت کی سلطنت یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوپہر کے وقت گرمی میں چلے جارہے تھے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا پوچھا کہ امیر المؤمنین کہاں چلے آپ نے فرمایا کہ بیت المال کا ایک اونٹ غائب ہوگیا ہے اس کی تلاش کو جارہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت آپ نے اس گرمی میں کیوں تکلیف کی کسی کو حکم دیا ہوتا کہ وہ تلاش کر لیتا آپ نے فرمایا کہ اے عثمانؓ میدان قیامت کی گرمی اس گرمی سے اشد ہے۔

غرض کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پر نہ تھے۔ یہ حضرات اس ترقی پر تھے کہ ساری دنیا جانتی ہے بلکہ مانتی ہے حالانکہ نہ ان کے پاس فٹن تھی نہ سامان آرائش اور فٹن تو کیا ہوتی واقعہ یرموک میں جو کہ ایک عظیم الشان جنگ تھی جب ایک شخص اونٹنی پر سوار فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہ روزانہ انتظار خبر میں باہر جا کر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے، جنگل میں ملاقات ہوئی آپ نے اس سے پوچھا کہ تُو کہاں سے آیا ہے، معلوم ہوا یرموک سے آپ نے جنگ کا حال پوچھا وہ چونکہ پہچانتا نہ تھا اس لیے کہ کوئی نشان خلافت نہ تھا کوئی تاج نہ تھا، اس نے ان کی طرف التفات نہیں کیا اور اونٹنی دوڑائے ہوئے چلا جاتا تھا اور یہ اونٹنی کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے۔ جب آبادی کی طرف قریب آئے تو لوگوں نے پہچانا اور امیر المؤمنین کو سلام کیا اس وقت اس کو معلوم ہوا تو اس نے بہت معذرت کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے ثواب کے لیے اٹھایا ہے تجھے عذر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حالت تھی۔ ایک ہماری حالت ہے کہ جو قدم اٹھتا ہے خود بینی اور خود داری کے لیے۔

غیر قوموں کی تقلید

ایک صاحب معزز مجھ سے فرمانے لگے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا لڑکا ایسا ہوجائے کہ پندرہ روپے میں گزر کرلیا کرے اور حالت لڑکے کی یہ تھی کہ پندرہ سے زیادہ کا اس کا ایک کوٹ ہی تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو دوسری قوموں کی تقلید نے برباد کیا ہم تقلید کرتے ہیں اور وہ بھی بری باتوں کی۔ انہوں نے ہماری تقلید کرکے اپنا گھر آباد کرلیا اور ہم ان کی تقلید کرکے اپنی رہی سہی حالت بھی برباد کیے دیتے ہیں۔ دعویٰ ہے قومی ہمدردی کا اور اجنبیت یہ ہے کہ شہر میں رہنا بھی گوارا نہیں، الگ جنگل میں جاکر رہتے ہیں۔ صاحبو! کیا ترقی اس پر موقوف ہے کہ قوم کا قرب بھی چھوڑ دیا جائے۔ دیکھئے! رئیسہ بھوپال والیٔ سلطنت ہیں آج کل کے ترقی یافتہ لوگوں سے تو بہرصورت بہت زیادہ ترقی پر ہیں مگر معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی غریب رعایا میں سے شادی وغیرہ میں ان کی دعوت کرتا ہے تو قبول کرتی ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ہمارے روشن خیال سب سے زیادہ دعوت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ مجھے ایک لکھنؤ کی حکایت یاد آئی۔ ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک سقے نے کی، مولوی صاحب اس کے گھر جارہے تھے کہ ایک رئیس صاحب ملے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں جارہے ہو، مولوی صاحب نے بیان کیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے ہاں جارہا ہوں تو رئیس صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو لٹیا ہی ڈبودی کیا سقوں کی دعوت بھی کھانے لگے۔ مولوی صاحب نے یہ سن کر سقے سے فرمایا کہ بھائی میں تو دعوت میں نہیں جاتا یہ رئیس صاحب اس کو ذلت سمجھتے ہیں، البتہ اس شرط سے چلتا ہوں کہ ان رئیس صاحب کو بھی لے چل۔ چنانچہ اس سقے نے ان کی منت کرنا شروع کی، اب تو رئیس صاحب بہت گھبرائے، اول تو عذر کیا مگر جب اس نے بہت ہی لجاجت کی اور دو چار ہم رتبہ آدمیوں نے بھی جو کہ اتفاقاً جمع ہوگئے تھے ملامت کی کہ ایک غریب آدمی اس قدر لجاجت کرتا ہے اور تم مانتے نہیں عجب سنگدل ہو تو مجبوراً ان رئیس صاحب کو ماننا پڑا۔ آخر اس کے گھر گئے وہاں جاکر دیکھا کہ تمام گھر میں فرش لگا ہوا ہے اور سقے دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں کوئی ہاتھ

چومتا ہے کوئی پاؤں پکڑتا ہے، آخر کھانا کھلایا اور خود غلاموں کی طرح کھڑے رہے جب وہاں سے فارغ ہوکر آئے تو کہا کہ حضرت واقعی میں غلطی پر تھا، آج مجھے معلوم ہوا کہ عزت وحرمت غرباء کے ساتھ رہنے میں ہے میں نے آج تک یہ تعظیم نہیں دیکھی تھی جو ان لوگوں نے کی۔ سچ یہ ہے کہ محبت کے لوگ یہی ہیں رؤسا کو جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اپنے نوکروں یا ماتحتوں میں، حق یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعظیم صرف ظاہری تعظیم خوف کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے بھیڑیئے کی تعظیم کی جاتی ہے۔

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ معاشرت تھی اور وہی حقیقی ترقی تھی اگر دنیا میں اس کی ترقی ہو تو اسلام کو بیشک ترقی ہے لیکن اگر ساری دنیا کے پاس مال وجاہ ہوجائے تو اسلام کی کچھ بھی ترقی نہیں یہ تو اہل دنیا کی شفقت کے متعلق بیان تھا۔

اہل دین کا شفقت میں غلو

اب ایک شفقت اہل دین کی ہے کہ ان لوگوں کو جوش اٹھتا ہے کہ جس طرح ہوسکے قوم کی اصلاح ہوجائے، اس کوشش میں مختلف طرح کی مشکلات ان کو پیش آتی ہیں اور ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جو کچھ مدارس یا انجمنیں قائم کرتے ہیں ان سے مقصود صرف اپنا نفع ہوتا ہے کہ ہم کو خوب روپیہ ملے یا ہمارا خوب نام ہو۔ یہ لوگ تو مصلحین کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں کہ واقعی وہ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی سچی تمنا یہ ہے کہ قوم کی حالت درست ہوجائے مگر ان کو شفقت میں غلو ہوگیا ہے اس میں اول تو جسمانی تکلیف ہوتی ہے دوسرے بعض اوقات دین کی بھی خرابی ہوجاتی ہے کہ اس کے اہتمام میں بعض ناجائز طریقوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے بہت پیچھے پڑنے سے عداوت ہوجاتی ہے۔ یاد رکھو "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا "[1] خدا تعالیٰ کے دربار میں وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی۔ مجھے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آتا ہے اگر ان کے پاس کوئی فہرست مسجد کے چندہ وغیرہ کی لے کر آتا اور دستخط کرنے

(۱) البقرۃ:۲۸۶

کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ میاں کیوں لوگوں کے پیچھے پڑے ہو مسجد یا مدرسہ بنانا ہی ہے تو کچی دیواریں اٹھا کر بنالو، اگر وہ کہتا کہ حضرت کچی دیواریں گر جائیں گی تو فرماتے کہ میاں پکی بھی آخر گریں گی تو جب گر جائیں گی کوئی دوسرا بنادے گا تم قیامت تک کا بندوست کرنے کی فکر میں کیوں پڑے۔ بات یہ ہے کہ

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ برنتا بد کوہ رایک برگ کاہ
چار پا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ (۱)

تو بوجھ اسی قدر اُٹھاؤ کہ تم سے اُٹھ سکے۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے:
''لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسه''(۲) کہ مؤمن کو چاہیے اپنے کو ذلیل نہ کرے۔ اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی تفسیر حضور ﷺ سے دریافت نہ فرمالیتے تو آجکل کے مدعیان اجتہاد اس کے یہ معنی سمجھتے کہ مومن کو پھٹا کپڑا نہ پہننا چاہیے بلکہ خوب بن سنور کر عمدہ پوشاک میں رہنا چاہیے۔ ''ومثل ذلك'' لیکن صحابہؓ نے پوچھ کر حل کردیا ''قالوا یا رسول اللّٰه وما یذل نفسه''(۳) حضور ﷺ نے تفسیر میں فرمایا:
''ان یتحمل من البلاء لما لا یطیقه''(۴) اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ تعلیم اسلامی ذلت اختیار کرنے سے مانع ہے مگر آج کل روشن خیالوں نے ذلت کو مولویت کا اثر سمجھ لیا ہے حالانکہ مولویوں سے زیادہ یہی لوگ اس ذلت کو اختیار کرتے ہیں۔
ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں مثل دیگر قصبات کے یہ رسم ہے کہ شادی میں دلہن کے میانہ پر بکھیر ہوتی ہے اس بکھیر کو بھنگی اٹھاتے ہیں چند روز ہوئے کہ وہاں شادی ہوئی اور اس موقع پر ایک دلدادہ تہذیب جدید نے ان بھنگیوں کے ساتھ مل کر بکھیرے کے پیسے جمع کیے، مشکل سے شاید تین چار آنے پیسے ان کے ہاتھ لگے، کیوں صاحب جب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے چندے کے واسطے یہاں تک گوارا کرلیا جاتا ہے تو اگر

(۱) ''تمنا کر لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کر اس لیے کہ پہاڑ کو ایک گھاس کا پتہ نہیں اٹھا سکتا، چوپایوں پر ان کی طاقت کے بقدر بوجھ رکھ، کمزوروں پر ان کی ہمت کے بقدر کام رکھ یعنی کام سپرد کر'' (۲) ''کسی مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے'' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۳، کنز العمال: ۵۳۰۴ (۳) ''انہوں (صحابہؓ) نے کہا اور اپنے نفس کی ذلت کیا ہے'' (۴) ''ایسی مصیبت کہ جس کے برداشت کرنے کی وہ اپنے اندر طاقت نہیں رکھتا''

کوئی مولوی اسلامی مدارس کے لیے چندہ جمع کرے تو اس کو بھک منگا کیوں کہا جاتا ہے؟ اور اس پر ذلت کا اطلاق کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر جب نماز کا وقت آیا اور وہ نماز پڑھنے کے لیے آئے تو ایک ظریف نے ان کی خبر لی، کہا کہ تم ہماری جماعت سے الگ ہوجاؤ کیونکہ تم نجس ہو، انہوں نے کہا میرے نجس ہونے کی وجہ۔ ان ظریف نے جواب دیا کہ چونکہ تم بھنگیوں کے ساتھ مل کر پیسے لوٹ رہے تھے اور اس وقت تم کو بھی پسینہ آرہا تھا اور ان کو بھی اور ان کے ناپاک بدن سے تمہارا بدن مس کرتا تھا مگر وہ ایسا باہمت تھا کہ اس کو اس سے کچھ بھی اثر نہ ہوا، پھر جب نیگ لینے (۱) کا وقت آیا تو آپ وہاں بھی جاموجود ہوئے آپ کو بھی ملا۔ الحمدللہ کسی مولوی نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی مگر چونکہ ان بیچاروں کی صورت غریبانہ صورت ہے وہ ایسی حرکات نہ کرنے پر بھی بھک منگے ہیں اور ان کی صورت چونکہ معزز ہے یہ بھیک مانگ کر بھی معزز رہے۔ مولویوں کے صدہا وعظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں چندہ کا نام بھی نہیں ہوتا اور ان صاحبوں کا کوئی لیکچر بھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں چندہ کی ترغیب نہ ہو۔ سید اکبر حسین صاحب جج نے خوب تضمین فرمائی۔

درپس ہر لکچر آخر چندہ ایست مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست (۲)

دوسرے یہ کہ بعضے مولوی اگر چندہ لیتے بھی ہیں تو دباؤ ڈال کر نہیں لیتے کیونکہ دباؤ ڈال کر وہ لے سکتا ہے کہ جس کا کچھ اثر ہو ان بیچاروں کا اثر ہی کیا ہے کہ ان کے دباؤ کا اثر پڑے۔ برخلاف ان حضرات کے کہ دباؤ ڈال کر ظلم کرکے وصول کرتے ہیں۔ غرض میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ تم کو اس حالت تک صرف تمہاری ضرورت سے زیادہ شفقت علی القوم لائی ہے پس تم اسی قدر شفقت کرو کہ جو تم کو تمہارے دین میں مضر نہ ہو (۳) بعضے اس لیے ناجائز کوشش کرتے ہیں کہ بدوں اس کے کام نہیں چلتا اس طرح کام بند ہوجائے گا مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کو کیا فکر قیامت میں اگر باز پرس ہوگی کہہ دینا کہ میں نے لوگوں کو ترغیب دی تھی مگر لوگوں نے نہ مانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ

(۱) شادی بیاہ کے موقع پر رشتہ داروں اور نوکروں کا اپنا حق وصول کرنا (۲) ''ہر لیکچر کے پیچھے چندہ ہے انجام کا دیکھنے والا آدمی خدا کا مبارک بندہ ہے'' (۳) نقصان دہ نہ ہو۔

اس جواب کے بعد تم پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ ہم نے اپنے وطن میں ایک مدرسہ کر رکھا ہے مگر اس انداز سے کہ نہ کسی سے چندہ مانگا جاتا ہے نہ کسی کو ترغیب دی جاتی ہے طلبہ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر توکل کر کے رہیں تو رہیں ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے دیا تو ہم دیدیں گے مگر باوجود اس استغناء کے اچھی خاصی طرح مدرسہ چل رہا ہے بلکہ یہاں تک انتظام کیا کہ طلبہ کی دعوت بھی جس میں کسی کے گھر جانا پڑے قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ دعوت کا کھانا لینا بھیک نہیں ہے مگر چونکہ آج کل طلبہ کی دعوت اکثر لوگ ان کو ذلیل سمجھ کر کرتے ہیں اس لیے ہم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور میں دینے والوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ طلبہ کو کچھ دیں تو عزت سے دینا چاہیے وہ آپ کے مہمان ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کا کوئی مہمان آکر مسجد میں ٹھہرے اور کھانے کے وقت گھر جانے سے انکار کرے تو آپ کیا کریں گے؟ آیا اس مہمان سے کہیں گے کہ دروازے پر جا کر کھانا لے آؤ یا مسجد میں جا کر خود اس کو کھانا دیں گے۔ پھر طلباء کے ساتھ یہ کیوں نہیں کیا جاتا اور جب تم نے خود ان کو دروازے پر بلایا تو گویا اپنے مہمانوں کو تم نے خود ذلیل کیا پھر کس منہ سے خود ہی ان کو ذلیل کہتے ہو۔ غرض بحمد اللہ مولویوں کی حالت تو ایسی گئی گزری نہیں ہے۔ بہرحال میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ اپنی یہ حالت چھوڑ دو اور کام کو چھوٹے پیمانے پر شروع کرو، تم لوگ یہ کرتے ہو کہ اول ہی سے کام کو بڑے پیمانے پر اُٹھاتے ہو اس کے لیے لابدی[1] زیادہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے مجبوراً تم کو ناگوار کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔

کام کرنے کی سہل ترکیب

ایک سہل ترکیب آپ کو بتلاتا ہوں کہ جو کام شروع کرنا ہو اتنا شروع کیجئے جو آپ اپنی ذات سے کر سکیں جب کام شروع ہو جائے گا اور دوسرے دیکھیں گے خود بخود تمہاری مدد کریں گے۔ دیکھئے! اسلام کا کام بھی یوں ہی ترقی پذیر ہوا، اگر اسلام کا کام متعارف ضابطے سے ہوتا تو کم سے کم ایک جماعت تو ہوتی حالانکہ وہاں صرف ایک تن تنہا

(۱) لازمی طور پر۔

حضور ﷺ کا مبارک دم تھا، خدا تعالیٰ اسلام کی ترقی کو بیان فرماتے ہیں: ''كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ الخ''(۱) تو صاحبو! ترقی اسلام کی ہمیشہ یوں ہی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہوا کہ شفقت کی بھی ایک حد معین ہے تم بھی اس پر رہو چنانچہ اس آیت میں اس مضمون کے متعلق حضور ﷺ کی تسلی فرمائی کہ شفقت ان لوگوں پر کیجئے کہ جن میں خدا کا خوف ہو اور وہ علماء ہیں۔ فرماتے ہیں: ''كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ'' (۲) ایک بات تو اس سے یہ ثابت ہوئی۔ دوسری بات اس آیت سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کا رتبہ نہایت عظیم الشان ہے کہ خدا تعالیٰ کو آپ کا غمگین ہونا کسی طرح منظور نہیں، جب کوئی بات ہوتی ہے فوراً تسلی فرمائی جاتی ہے اور حضور ﷺ کی شان تو اور ہی ہے آپ کے اولیاء امت کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے۔ فرماتے ہیں: ''لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ''(۳) ان کی ہر وقت یہ حالت ہے کہ

کوئے نومیدی مرد کامید ہاست سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست (۴)

کبھی ان حضرات کا دل منقبض (۵) نہیں ہوتا ہمیشہ شاداں رہتے ہیں (۶) اور کیونکر نہ رہیں ان حضرات کے پاس وہ چیز ہے کہ جس کے پاس ہوگی شاداں ہی رہے گا بلکہ ان حضرات کے سرور (۷) کی یہ حالت ہے کہ ان کو سلاطین پر رحم آتا ہے اور لوگ تو ان کی ظاہری حالت پر رحم کرتے ہیں کہ ان بے چاروں کو کھانے کو نہیں ملتا، بھوکوں مرے جاتے ہیں اور یہ حضرات اہل دنیا پر رحم کھاتے ہیں کہ ان کو ہیضہ ہو رہا ہے سمّیّت (۸) تمام جسم میں سرایت کر گئی ہے اور ان کو حس تک نہیں اس مرض کو مبارک مرض سمجھ رکھا ہے۔ صاحبو! تم ان فاقہ مستوں اور روزہ داروں پر رحم مت کرو اپنی حالت

(۱) ''مانند اس کھیتی کے جس کو اس نے اُگایا ہو پھر اس کو ہلاک کر دیا ہو'' سورۃ الفتح: ۲۹ (۲) ''بیشک ڈرتے (خوف کرتے) ہیں اس کے بندوں میں سے علماء'' سورۃ الفاطر: ۲۸ (۳) ''بشارت ہے ان لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں'' سورۃ یونس: ۶۴ (۴) ''ناامیدی کے راستہ کی طرف مت جا کہ امیدیں بہت ہیں تاریکی اور اندھیرے کی طرف مت جا کہ بہت سے سورج موجود ہیں'' (۵) دل تنگ نہیں ہوتا (۶) خوش (۷) خوشی کی (۸) زہر پورے جسم میں پھیل رہا ہے۔

پر رحم کرو ان کے لیے خوان نعمت تیار ہورہا ہے ان کو کہا جائے گا'' كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ''(۱) اسی لیے ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کو ایک قطعہ لکھا ہے جس میں اپنا کھانا اس کا کھانا اپنا پہننا اس کا پہننا سب بیان کر کے آگے فرماتے ہیں

نیک ہمیں ست کہ مے بگذرد راحت تو محنت دوشین ما(۲)

یعنی یوں ہی کام چلنے دو۔

باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید دیا ایں ما(۳)

یعنی اس روز معلوم ہوجائے گا کہ کونسی حالت عمدہ تھی۔ غرض اہل دنیا کو ان پر رحم آتا ہے مگر رحم کے قابل درحقیقت وہ ہیں۔ حاصل یہ کہ اللہ والوں کے غم کے وقت اب بھی تسلی ہوتی ہے تو اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی گئی ہے چونکہ تمہید میں بہت سا وقت ختم ہوگیا ہے۔

خشیت صرف علم سے ہوتی ہے

اس لیے مقصود کو اب مختصراً بیان کر کے ختم کر دیا جاتا ہے اور مقصود کے اختصار کا اس لیے مضائقہ نہیں کہ نتائج اکثر مختصر ہی ہوا کرتے ہیں اور یہی راز ہے: الدین یسر کا کہ یہ یسر مختص ہے مقصود کے ساتھ، آجکل ہمارے بھائیوں نے غلطی کی ہے کہ ہر جگہ ''الدین یسر ''(۴) لے لیا حالانکہ مصداق اس کا صرف نتیجہ ہے، ذرائع مراد نہیں۔ مثلاً اگر یوں کہئے کہ ''الاکل یسر '' تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اکل کے ذرائع مثلاً کھیتی کرنا وغیرہ وغیرہ یہ بھی آسان ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ کھیتی وغیرہ کا جو نتیجہ ہے یعنی اکل وہ آسان ہے۔ ہمارے بھائیوں نے یہ معنی سمجھ لیے کہ نہ علم کی ضرورت نہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت نہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ اعمال وطاعات کی ضرورت کیونکہ '' الدین یسر ''

(۱) ''خوشی خوشی کھاؤ اور پیؤ اس چیز کی وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے'' سورۃ الطور:۱۹ (۲) ''یہ ہی ہے کہ گزرتی ہے تیری راحت ہماری گزشتہ راحت کی محنت ہے'' (۳) '' تو ٹھہر یہاں تک کہ قیامت کا نقارہ بجادیں تیری ملکیت اچھی ثابت ہوتی ہے یا ہماری'' (۴) الدر المنثور:۱/ ۱۹۲، کشف الخفاء:۱/ ۴۹۸

غرض مقصود مختصر بھی ہے اور وقت بھی کم رہ گیا ہے اس لیے اس کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کیوں غم فرماتے ہیں آپ تو ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جن کو خشیت ہو اور خشیت صرف علم سے ہوتی ہے اسی لیے بصیغہ حصر فرمایا اور علم ان کو ہے نہیں مگر اس کا ہونا ان کے قبضے کی بات تھی۔ پس جب یہ خود ہی توجہ نہیں کرتے آپ بھی غم نہ فرمایئے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ علم میں کیا فضیلت ہے اور یہی مقصود ہے۔ دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوگی کہ علم موقوف علیہ ہے خشیت (۱) کا اور شرط ہے اس کی، گو علت تامہ خشیت کی نہیں اس جملہ کو طلبہ یاد رکھیں۔ آگے چل کر اس سے کام لیا جائے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ خشیت جو موقوف ہے علم پر کیسی چیز ہے تو علم بھی اسی درجے کی چیز ہوگی کیونکہ موقوف علیہ واجب کا واجب اور مندوب کا مندوب ہوتا ہے (۲) تو نصوص میں دیکھنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت کے برابر کوئی چیز مہتم بالشان اور اس سے زیادہ واجب نہیں، کسی کسی مقام پر اس کو بلفظ تقویٰ بھی فرمایا گیا ہے جیسے ''هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ'' (ہدایت ہے متقین کے لیے) میں اس جملہ کی اگرچہ دوسری تفسیر بھی ہے لیکن سیدھی تفسیر یہ ہے کہ تقویٰ کے معنی خوف کے لیے جائیں اور معنی یہ ہوں کہ ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے کیونکہ جب خوف پیدا ہوگا تب ہی حق کی تلاش بھی ہوگی۔ خوف وہ چیز ہے کہ اسلام بھی اسی کی بدولت پھیلا یہ تو نقلی طور پر خشیت کا مہتم بالشان ہونا ثابت ہوا۔ اب عقلی طور پر لیجئے! ظاہر ہے کہ انتظام عالم کا بقاء خشیت ہی سے ہوتا ہے۔ دیکھئے انسان جو قبائح (۳) سے بچتا ہے تو کیوں؟ یا تو محض تعلیم اخلاقی سے بلا کسی خشیت کے یعنی اس لیے کہ یہ کام برا ہے اور برے کام سے بچنا چاہیئے، مگر دنیا میں اس انداز کی طبیعتیں بہت کم ہیں کہ صرف یہ تعلیم ان کے لیے مانع ہوجائے (۴)۔ فرض کیجئے کہ دو شخص ایک ساتھ سفر کریں اور ان میں سے ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے اور دوسرا تہی دست ہے اور اتفاق سے یہ دونوں ایک پہاڑ پر پہنچ گئے جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں اور تہی دست اس دوسرے کا مخالف بھی

(۱) علم ذریعہ ہے خوف الٰہی کا (۲) جس پر کوئی کام موقوف ہو اس کا وہی حکم ہوگا جو اس کام کا ہو واجب ہے تو واجب مستحب ہے تو مستحب (۳) بری باتوں سے (۴) رکاوٹ۔

ہے مذہباً بھی اور خاندانی طور سے بھی اور پہاڑ پر پہنچ کر اس تہی دست کے دل میں روپے کا لالچ پیدا ہوا اور نفس نے رائے دی کہ اس کو قتل کر کے روپیہ اپنے قبضے میں کرلو اور یہ قادر بھی ہوا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس موقع پر کون چیز ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے، دنیاوی خوف تو اس لیے مانع نہیں ہوسکتا کہ یہ فرض کیا جاچکا ہے کہ اس مقام پر کوئی دیکھنے والا نہیں، غرض دنیا بھر کے سارے اجزاء تلاش کر لیجئے کوئی چیز سوائے خشیت خداوندی کے ایسی نہ ملے گی کہ اس کو اپنے ارادے سے روک سکے۔

تو دیکھئے اس غریب کی جان بچانے کے لیے اس موقع پر اگر کوئی چیز مدد کو پہنچی تو وہ صرف خشیت اور مذہب ہے اس کے سوا ہزاروں صورتیں ایسی ہیں کہ اگر مذہب کی روک نہ ہو تو انسان کسی طرح نہیں رُک سکتا۔ اودھ میں ایک سب جج مسلمان کے ہاں دو تعلق داروں کا مقدمہ تھا۔ ایک فریق ایک لاکھ روپیہ اور دوسرا سوا لاکھ روپیہ رشوت لے کر پہنچے۔ اب بتلایئے کہ کس چیز نے ان کو رشوت لینے سے روکا، کیا تہذیب یا تعلیم نے، ہرگز نہیں سینکڑوں تہذیب اور تعلیم یافتہ عام لوگوں کا گلا دبا کر دو دو چار چار روپیہ تک وصول کر لیتے ہیں اور اگر کسی مہذب نے اس سے احتراز ہی کیا تو اسی وقت تک کہ جب تک قلیل مقدار ہو ورنہ اتنی بڑی مقدار کے سامنے تہذیب میں ہرگز قوت نہیں رہ سکتی یہ صرف خدا کا خوف تھا جس کی بدولت وہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہوئے اور دونوں کی رشوت لینے سے انکار کر دیا اور ہم نے تو آج کل ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ تھوڑی مقدار بھی لینے میں ان کو عار نہیں۔ ایک عہدیدار کو کسی دیہاتی نے ایک روپیہ رشوت دینا چاہی، اتفاق سے جیب میں ایک روپیہ اور ایک ادھنا[1] پڑا تھا چونکہ ہاتھ بند کر کے دیا اس لیے پتا نہ چلا اور بجائے روپیہ کے ادھنا دینے لگا، اس عہدیدار نے اول لینے سے انکار کیا مگر جب اس نے اصرار کیا تو لے لیا، گھر پر جا کر جو اس دیہاتی نے جیب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بجائے روپیہ کے ادھنا دے دیا ہے بہت شرمایا اور شرم اتارنے کو ان کے پاس آیا اور معذرت کر کے ان کو روپیہ دیا اور ادھنا واپس مانگا، ان حضرت نے روپیہ بھی لے لیا اور ادھنا واپس نہ دیا اور فرمایا میاں واپس کیوں دیں آخر

(۱) پرانے ایک آنے کا نصف یعنی دو پیسے کا سکّہ

کچھ آیا ہی ہے گیا تو نہیں۔ تو بعض کی تہذیب تو اس قدر سستی ہوتی ہے کہ دو پیسہ میں بھی بک جاتی ہے اور جن کی کچھ قیمتی ہے وہ محض تھوڑی مقدار ملنے کے وقت مانع ہوتی ہے ورنہ اگر ان کو لاکھ دو لاکھ روپیہ ملے تو ہرگز نہ چھوڑیں۔ غرض قبائح (۱) سے روکنے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف مذہب اور خشیت (۲) خداوندی ہے تہذیب ہرگز نہیں روک سکتی۔

آج کل کی تہذیب

آج کل کی تہذیب کی حقیقت اور اس کا انجام اگر دیکھنا چاہیں تو کتاب مآل التہذیب مصنف مولوی قمرالدین صاحب مرحوم کو دیکھیں اس کے نو مقالے تیار ہونے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے جا بجا دکھلایا ہے کہ اس تہذیب کا مآل (۳) کیا ہونے والا ہے اور ہر مضمون کے آخر میں یہ ظرافت آمیز جملہ بھی موجود ہے کہ ''فویل یومئذٍ للمھذبین'' (پس تہذیب یافتہ لوگوں کے لیے اس دن خرابی ہے) اگر اعتقاد سے بھی اس کتاب کو نہ دیکھا جائے تو اس کو ایک ناول ہی فرض کر کے دیکھ لو۔ خلاصہ یہ ہے کہ خشیت ہی سے دین و دنیا کے انتظام کا بقاء ہوسکتا ہے اگر خشیت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں اور ایک نئے انداز سے سمجھئے کہ اگر خشیت قلب میں ہو تو اس سے نرمی پیدا ہوگی اور نرمی سے اخلاق حمیدہ جن کی آج بھی تعلیم ہوتی ہے جیسے ایثار وغیرہ یہ سب با آسانی پیدا ہوسکیں گے اور اس سے نظام عالم احسن صورت پر باقی رہے گا پس اس اخلاق کو بھی روح تمدن کہا جائے وہ بھی خشیت ہی سے درست ہوتے ہیں لیکن شریعت کا موقوف علیہ علم دین کیونکہ جب تک کسی چیز کا علم نہ ہوگا اس وقت تک اس کا خوف پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص کی گائے کھوگئی تھی اس کی تلاش میں نکلا، رات کے اندھیرے میں پتہ تو چل نہیں سکا ایک شیر کو پکڑا دیکھا، سمجھا کہ گائے ہے کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا جب معلوم ہوا تو روح ہی نکل گئی تو واقعی بدون معرفت کے خشیت نہیں ہوسکتی۔

صاحبو! میں نے علم کے فضائل نہیں بیان کیے کیونکہ اول تو وقت نہیں دوسرے آج کل کے عقلاء کو نرے فضائل سے تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ عقل سے اس کی

(۱) برائی سے (۲) مذہب اور خوف خدا ہے (۳) انجام

ضرورت ثابت نہ کی جائے حالانکہ عقل اس درجے کی چیز نہیں کہ ہر امر میں اس کو مدار قرار دیا جائے۔ حکم عقل موجب پریشانی اور شرع موجب راحت ہوتا ہے۔ خوب کہا گیا ہے

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را(۱)

اور واقعی اگر عقل کو ہر بات میں حکم (۲) بنایا جائے تو ہم کو بڑی مشکل پڑے گی۔ مثلاً یہ قاعدہ عقلی ہے کہ منعم علیہ پر منعم کا شکر بقدر نعمت کے واجب ہے۔ پس اگر اس قاعدہ میں ہم عقل کو حکم بنائیں تو ذرا غور کیجئے کہ ہم کو کتنی مشکل درپیش ہوگی کیونکہ ہر سانس کی آمدورفت میں ہم پر دو نعمتیں ہیں۔ پس اس طرح دن رات میں کتنی نعمتیں ہم پر ہوئیں اور ان کی کثرت کے لحاظ سے کتنا شکر ہم پر واجب ہوا تو بتلائیے کہ اس شکر کو کون ادا کرسکتا ہے اور نہ ادا کرو تو عقل مجرم ٹھہراتی ہے۔ اب شرع کا احسان دیکھئے کہ اس میں سے تھوڑی سی مقدار کو واجب قرار دیا تو ہر جگہ عقل کی ٹانگ اڑانا سخت مشکل کا اٹھانا ہے مجبوراً یہی کہنا پڑے گا کہ

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را(۳)

ہاں عقل بیکار بھی نہیں وہ اتنا کام دے سکتی ہے کہ اس سے یہ معلوم کرلیا جائے کہ حاکم کون ہے؟ اور جب یہ معلوم ہوگیا تو آگے عقل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقل سے معلوم ہوسکتا ہے مگر اس کے ہر قانون کی لم (۴) ہرگز ہر شخص کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ عقل کی حالت بالکل گھوڑے کی سی ہے تو دیکھئے اگر آپ کا ایک محبوب پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور آپ سے وہاں تک چار میل کا فاصلہ ہو جن میں دو میل سڑک اور دو میل پہاڑ کی چڑھائی ہو تو آپ گھوڑے کی سواری کہاں تک کریں گے۔ ظاہر ہے کہ دامن کوہ تک سواری ہوسکے گی، آگے جہاں سے کوہی زینہ (۵) شروع ہوا ہے وہاں سے گھوڑا بیکار ہے پس اسی طرح فرعیات (۶) کے زینہ میں عقل کو مرکب (۷) بنانا اوندھے منہ گرنے کی کوشش کرنا ہے وہاں سے یہ حالت ہونی چاہیے کہ

وزن جابال محبت پری

(۱) ''بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمالیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنالیا'' (۲) جج مقرر کرلیا جائے (۳) ''بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمالیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنالیا'' (۴) قانون کی وجہ (۵) پہاڑی چڑھائی شروع ہوئی (۶) فروعی مسائل میں (۷) سواری بنانا۔

فضیلت علم دین

غرض آپ کو معلوم ہوا کہ علم دین کیا چیز ہے کہ نظام عالم اس پر موقوف ہے۔ صاحبو! میں یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا عالم اصطلاحی بنے مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ علم دین خواہ وہ اردو میں ہو، خواہ فارسی میں، خواہ عربی میں اور خواہ کتاب سے یا صحبت سے ہر شخص کو سیکھنا چاہیے اور اس کے بعد تھوڑا سا چسکا خشیت کا بھی ضرور لینا چاہیے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ علم کے بعد تو خشیت ہو ہی جائے گی تو سمجھو کہ علم موقوف علیہ ہے اور شرط ہے خشیت کی نہ کہ خشیت کی علت تامہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خشیت بدون علم کے نہیں ہوتی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں علم ہوگا خشیت بھی ضرور ہوگی اور یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے پہلے کہا تھا کہ طلبہ اس جملہ کو یاد رکھیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس مقام پر دو شبے ہو رہے ہیں ایک تو علماء کو، ایک عوام کو۔ علماء کو تو یہ شبہ ہوا کہ "إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ"(۱) فرمایا گیا ہے اور ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے اور جب خشیت بھی ہے تو ہم اس فضیلت میں داخل ہوئے اور مخدوم الخلائق ووارث نبی ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ محض علم سے خشیت ہونا ضروری نہیں اس کے لیے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ وہ دنیا کے بندے ہیں اور ان کو خدا کا خوف کچھ بھی نہیں ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ بھی زائل ہوگیا۔ عوام کے اعتراض کا اکثر لوگ یوں جواب دیا کرتے ہیں کہ جس عالم کو خوف خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے۔

پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے۔ یہ جواب فی نفسہ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا اس لیے کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہوگی اور علم سے مراد علم مع الخشیت (۲) ہوگا۔ پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر۔ پس تقدم الشئ علی نفسه لازم آئے گا (۳) اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کا موقوف علیہ ہے علم، اس کو حاصل کرو۔ لیکن علم حصول خشیت کی علت تامہ نہیں بلکہ اس علت کا ایک جزو ہے۔ دوسرا جزو قرآن شریف کے دوسرے مقام سے

(۱) "بے شک خدائے تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں" سورۃ الفاطر:۲۸ (۲) علم خوف کے ساتھ (۳) کسی چیز کا اس کے وجود سے پہلے ہونا لازم آئے گا اس سے دور لازم آتا ہے جو محال ہے

معلوم ہوا یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ(۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تقویٰ بمعنی خشیت کا حکم ہے پھر وَلْتَنظُرْ میں اس کا طریقہ ہے کہ اپنے اعمال کو سوچا کرو اس کے بعد بطور نتیجہ کے ارشاد ہے کہ اتَّقُوا اللّٰہ یعنی یہ غور وفکر کرو گے تو تم کو تقویٰ وخوف حاصل ہو جائے گا۔ علاوہ آیت کے تجربہ سے بھی معلوم ہے کہ نرے علم سے خشیت نہیں ہوتی بلکہ علم کے ساتھ غور وخوض کی ضرورت ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ ''اذا فات الشرط فات المشروط''(۲) اور دوسری چیز یہ ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر خوب سوچا کرو کہ قیامت کے لیے ہم نے کیا سامان تیار کر رکھا ہے جب وہاں پوچھ ہوگی تو ہم کیا جواب دیں گے جس کو دوسری جگہ فرماتے ہیں: اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (۳) اس سے ایک خاص اثر پیدا ہوگا اور جس کو اصطلاح میں حال کہتے ہیں۔

اصلاح کے لیے تین امور کی ضرورت

اصلاح میں تین امر ضروری ہوئے ایک علم دوسرا عمل، تیسرا حال چونکہ جب تک حال نہ ہو نرے علم وعمل سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ زنا حرام ہے اور اس پر عمل بھی کرے کہ زنا سے بچا رہے لیکن اس عمل کو بقاء اس وقت نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس عمل میں صاحب حال نہ ہو جائے بغیر حال کے عمل ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی کہ اس کو ہاتھ سے دھکیل کر کچھ دور تک لے جایئے لیکن جہاں چھوڑ دیجئے رہ جائے گی کیونکہ اس میں آگ نہیں پس یا تو خود انجن بن جاؤ کہ تمہارے اندر آتش محبت الٰہی بھری ہو نہیں تو کسی انجن کے ساتھ ہو لو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہی حالت ہوگی جس کو پہلی مثال میں عرض کیا۔ حضرت عراقی کہتے ہیں

صنمارہ قلندر سزا وار بمن نمائی کہ دراز ودور دیدم رہ ورسم پارسائی(۴)

پارسائی سے مراد عمل محض ہے کہ دور دراز رستہ ہے بلکہ اس رستے میں اکثر

(۱) ''اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور چاہئے کہ ہر نفس غور کرے کہ کل کے لیے کیا بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو'' سورۃ الحشر: ۱۸ (۲) ''جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت ہوگیا'' (۳) ''قریب آگیا لوگوں کے لیے ان کا حساب اور وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کرنے والے ہیں'' سورۃ الانبیاء: ۱ (۴) ''اے صنم قلندر کا راستہ لائق ہے اگر تو مجھ کو دکھائے اس واسطے کہ میں پارسائی کے راہ ورسم سے دور دیکھتا ہوں''

نیت بھی خراب ہوجاتی ہے اور اخلاص کے ساتھ ریا شامل ہوجاتی ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں:

بزمیں چو سجدہ کردم زز میں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدہ ریائی (۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

بہ طواف کعبہ رفتم بہ حرم رحم نداوند کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی (۲)

غرض حال نہ ہو تو عمل اکثر بیکار تصور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ نرا حال بھی کافی نہیں۔ جیسا کہ آج کل جہلاء نے برنگ تصوف اس کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ اول تو قرآن شریف سے عمل کی ضرورت ثابت ہے دوسرے عقلاً بھی حال کے لیے عمل لازم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص محض صاحب حال ہو اور اس کا حال کبھی ظہور پذیر نہ ہو اور یہی عمل ہے دیکھو اگر مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو تو کیا حالت ہوتی ہے کہ اول تو اس کو دیکھتے ہی اس کی تعظیم کے لیے زمین پر گر پڑے گا پھر جا کر اس کو لپٹ جائے گا، کیا یہ ممکن ہے کہ محبوب کو دیکھے اور اس کو حرکت بھی نہ ہو۔ یوں ہی دیوار کی طرح کھڑا رہے تو اگر ان درویش کو محبت خداوندی ہے تو اس کا ظہور کیوں نہ ہوتا، اطاعت کیوں نہ ہوتی۔

خشیت حال

غرض علم بھی ضروری عمل بھی ضروری حال بھی ضروری پس ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ'' میں خشیت حال ہے اس سے بقاء اور سہولت ہوتی ہے۔ گویا خشیت ہی سے عمل کی بقاء ہوتی ہے (۳)۔ اسی سے عمل میں سہولت ہوتی ہے، اسی سے عمل کی توفیق ہوتی ہے کیونکہ جب تک چسکا نہ ہو کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے بلکہ حال ہی سے دنیا کے کام بھی چلتے ہیں۔ دیکھئے اگر رات کے دو بجے کسی جگہ ریل میں جانا ہو تو عین وقت پر بلا کسی کے بیدار کیے خود بخود آنکھ کھل جانا یہ حال ہی کی بدولت ہے اور صاحبو! یہی حال اور جاذب وہ چیز ہے کہ آپ کو تو کیا سونے دیتا اس نے تو محبوب حقیقی تک کو تمہاری طرف متوجہ کر دیا ہے۔ خوب کہا ہے

عشق رانا زم کہ یوسفؑ رابہا زار آورد (۴)

---

(۱) ''جب میں نے زمین پر سجدہ کیا زمین سے ندا آئی کہ تو نے ریا کے سجدہ سے مجھ کو خراب کیا'' (۲) ''میں کعبہ مکرمہ کے طواف کے لیے گیا مجھ کو حرم کا راستہ نہ دیا اس واسطے کہ دروازہ کے باہر تو نے کیا کیا ہے کہ جس کے سبب حرم میں داخل ہو'' (۳) خوف خداوندی سے ہی ہمیشہ عمل کر سکتا ہے (۴) ''عشق پر ناز کرتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لایا''۔

تو زلیخا کو تو کیا چین ہوتی یوسف علیہ السلام کو بھی چین سے کنعان میں نہ بیٹھنے دیا

ہمچو صنعا زاہدے رازیر زنار آورد(۱)

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ مراد زنار سے بدنامی اور ملامت ہے اور واقعی جو شخص عشق کے رنگ میں آتا ہے بدنام ہوتا ہے ہمارے ایک دوست ہیں ڈپٹی کلکٹر جس روز سے ان پر یہ حالت غالب ہوئی ہے دنیا سے دل سرد ہوگیا ہے اب صرف ان کو یہی ایک سبق یاد ہے۔ بس گویا یہ حال ہے کہ

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم (۲)

ان کے خاندان کے لوگ ان سے خفا اور میرے شاکی ہیں کہتے ہیں کہ قیامت میں ان سے باز پرس ہوگی۔ یہ قوم کے افراد کو تباہ کررہے ہیں مگر میں اس کے جواب میں وہی کہوں گا جو کہ ہمارے بزرگ حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے ایک ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ میاں ہم کو بھی تو کسی نے بگاڑا ہے ہم کو بھی یہی بگاڑنا آتا ہے لوگ کیوں ہمارے پاس بگڑنے آتے ہیں ہم کسی کو بلانے تو نہیں جاتے۔ صاحبو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے قوم کے افراد کو کیا بگاڑ دیا، نوکری سے میں منع نہیں کرتا، قطع تعلقات کو میں نہیں کہتا، ہاں یہ کہتا ہوں کہ فرعون نہ بنو تم کسی کے بندے ہو بندگی اپنا شعار رکھو۔ غرض عاشق کے لیے بدنامی لازم ہے یہ معنی ہیں (ہمچو صنعا زاہدے را) کے لیکن صاحب محبت کو بدنامی کی ذرا پروا نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خواہیم ننگ ونام را(۳)

بلکہ بدنامی سے قلب میں اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ہمت بڑھتی ہے اور یوں کہتا ہے کہ

ساقیا برخیزد در دہ جام را خاک برسر کن غم ایام را(۴)

اور

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خواہیم ننگ ونام را(۵)

(۱) ''زاہد صفا کی طرح زنار کے نیچے لایا'' (۲) ''جو کچھ پڑھا ہم نے بھلا دیا مگر یار کی باتیں نہیں بھلائیں کہ ان کا بار بار تکرار کرتے ہیں'' (۳) ''اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ ونام کو نہیں چاہتے'' (۴) ''اے ساقی اُٹھ تو اور جام دے تو اور زمانہ کے غم پر خاک ڈال'' (۵) ''اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ ونام کو نہیں چاہتے''

الحاصل اس کو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی اس کا یہ مذہب ہوتا ہے۔

عاشق بدنام کو پروائے ننگ ونام کیا اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

غرض جب یہ محبت اور جمال محبوب تک کو متوجہ کر دیتا ہے تو آپ کو تو کیا چین سے رہنے دے گا۔ بس یہ حالت ہوتی ہے کہ:

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہردم جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا (۱)

کہ ہر وقت گھنٹی بج رہی ہے کہ چلو اور بیدار ہو۔ دوسری جگہ کہتے ہیں:

ایں قدر ہست کہ بانگے جرسے می آید

اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ واقعی گھنٹی بجتی ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھنٹی کا کام جگا دینے کا ہے ان کے دل میں ہر وقت ایک محرک تقاضا کرتا ہے اور وہی حال ہے اسی نے بزرگوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ رات بھر روتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن گو بدم من سر من پیدا مکن (۲)

ایک اور بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات بھر پریشان رہتے، جب بیوی زیادہ تقاضا کرتی تو آرام کرتے لیکن تھوڑی دیر میں پھر چونک کر اٹھ بیٹھتے اور فرماتے کہ کیا کروں، یہ آیت نہیں سونے دیتی۔ ''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِیكُمْ نَارًا ''(۳) حاصل یہ کہ تقویٰ کے لیے فکر غد (۴) ضروری ہے کہ یوں سوچے کہ اس کے لیے ایک خاص زاد کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہم بالکل مفلس پراگندہ ہیں، یہ ایسا افلاس ہے کہ دنیا کا افلاس اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، دنیا کا افلاس آخر ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس افلاس کا کہیں خاتمہ نہیں۔ وہاں یہ حالت ہوگی:

کہ بازار چند آنکہ آگندہ تر تہید ست را دل پراگندہ تر (۵)

کہ وہاں کا بازار گرم تھا، اقسام اقسام کی عمدہ چیزیں سجی ہوں گی مگر تمہاری جیب خالی ہوگی۔ ذرا غور کرو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی؟

---

(۱) ''مجھ کو جاناں کی منزل میں کیا امن وعیش جبکہ ہر سانس گھنٹہ فریاد رکھتا ہے کہ عمل باندھو' (۲) ''اے خدا اس بندہ کو ذلیل مت کر گرچہ میں برا ہوں میرے بھید کو ظاہر مت کر' (۳) ''اے ایمان والو! اپنے آپ اور اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ' سورۃ التحریم:۶ (۴) آنے والے کل کی فکر ضروری ہے (۵) ''بازار کتنا ہی سامان سے زیادہ بھرا ہوا ہے خالی ہاتھ والے کا دل زیادہ پریشان ہوتا ہے''۔

روزانہ اپنے محاسبہ کی ضرورت

صاحبو! ہنوز وقت باقی ہے اپنا علاج کرلو اور زادراہ(۱) جمع کرلو" وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ "ایک کلیہ ہے اللہ کے بندوں نے اس کے جزئی طریقے نکال کر بتلادیئے ہیں ان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ دن رات میں ایک وقت تجویز کرلو اور اس وقت بیٹھ کر سوچا کرو، سب سے اول یہ سوچو کہ خدا تعالیٰ کی کیا نعمتیں ہم پر ہیں اس کے بعد یہ سوچو کہ ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ہم اس کی نعمتوں کا کس قدر شکر ادا کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں تو صبح سے شام تک کے گناہ ہی گن ڈالے اس کے بعد غور کرے کہ اگر ہمارا یہ برتاؤ کسی دوسرے سے خصوصاً حاکم یا آقا سے ہوتا تو وہ کیا کرتا اور جو کچھ ذہن میں آئے اس کی بابت سوچے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ یہ کرسکتا ہے اس کے بعد سوچے کہ میدان قیامت برپا ہے، آفتاب قریب آگیا ہے، احکم الحاکمین کا اجلاس ہورہا ہے، نہ کوئی بیرسٹر ہے نہ کوئی وکیل ہے اور اس اثناء میں مجھے پکارا گیا ہے، فرشتے آئے اور مجھ کو پکڑ کر لے گئے اور وہاں لیجا کر چھوڑ دیا، اب مجھ سے میرے اعمال کی باز پرس ہورہی ہے اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں کوئی ٹھکانا ہے کہ وہاں بھاگ کر پناہ لوں ہاں سامنے جہنم ہے ملائکہ گرفتار کرکے مجھ کو

پا بدستے دگرے دست بدست دگرے(۲)

جہنم کی طرف لے جارہے ہیں۔ بس یہ سوچ کر فوراً سربسجود ہوجاؤ اور نہایت گڑگڑا کر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور رونا نہ آئے رونے کی صورت بناؤ اور یہ دعا کرو کہ اے خدا میرے گناہوں کو معاف کر اور مجھے ہمت دے کہ مجھ سے گناہ نہ ہوں۔ یہ تو رات کو کرے اور دن میں علماء کے رسائل لے کر ان کو پڑھے اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی پڑھاوے۔ اگرچہ بچے انگریزی ہی پڑھتے ہوں، افسوس تم لوگ اولاد کو کندہ(۳) جہنم بنانے کے لیے پرورش کرتے ہو۔ صاحبو! جب ان کا مآل(۴) یہ ہوا تو ان کے پیدا ہونے سے اور پرورش ہونے سے کیا نفع ہوا اس سے تو پیدا نہ

(۱) راستہ کی ضروریات۔ (۲) پاؤں بھی دوسرے کے قبضہ میں ہاتھ بھی دوسرے قبضہ میں (۳) دوزخ کا ایندھن (۴) انجام

ہوتے اور بچپن میں مرجاتے تو اچھا تھا۔

مرا اے کاشکے مادر نمیزاد وگر میزاد کس شیرم نمی داد(۱)

اور ان رسائل میں جہاں شبہ ہو اس کو علماء سے حل کرلو

خشیت پیدا کرنے کا طریقہ

جب یہ دو کام شروع کردو گے ان شاء اللہ خود بخود اعمال کی توفیق ہوگی اور یہ حالت ہوجائے گی جس کو فرماتے ہیں: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (۲) کہ تقویٰ سے مراد شخصیت اور قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا سے مراد اعمال، جب یہ دو کام جمع کرلو گے تو اس سے خشیت پیدا ہوگی پھر اعمال خود بخود درست ہوجائیں گے اور یہ زندگی عمدہ زندگی ہوجائے گی، پھر یوں کہہ سکو گے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما(۲)

تم اپنی اس زندگی موجود پر کیا ناز کرتے ہو حیات یہ ہے جس کو حیات ابدی کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ موت تو آئے گی پھر جدیدہ عالم پر دوام کہاں ہوا۔

تو سمجھو کہ وہ موت ظاہری موت ہے وہ ایسی موت ہے کہ جس کی تم خود تمنا کروگے کہ وہ آئے تو یہ ہیولانی حجابات کی دیوار اُٹھے اور موت کے وقت یوں کہو گے

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم(۳)

گویا جسم کے چھوٹنے پر خوش ہوگے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تادر میکدہ شاداں وغزلخواں بروم(۴)

---

(۱) ''مجھ کو کاش کہ میری ماں نہ جنتی اور اگر پیدا کرتی کوئی مجھ کو دودھ نہ دیتا'' (۲) ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کہو سیدھی بات درست کردے گا وہ تمہارے لیے اعمال کو'' سورۃ الاحزاب: ۷۰، ۷۱ (۱) ''ہرگز نہیں مرتا وہ شخص کہ اس کا دل عشق سے زندہ ہوگیا، دنیا کے تمام اخبارات پر ہمارا دوام ثابت ہوگیا'' (۳) ''وہ وقت آگیا کہ میں برہنہ ہوجاؤں جسم کو چھوڑ دوں اور بالکل روح ہوجاؤں'' (۴) ''میں خوش ہوں گا اس دن کہ اس ویران منزل (دنیا) سے چلا جاؤں گا، روح کا آرام طلب کرتا ہوں اور جاناں کے دربار میں چلا جاؤں، میں نے نذر کی کہ اگر یہ دن غم کے ساتھ بسر ہوجائیں تاکہ شراب خانہ کی طرف خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں''۔

حکایت حضرت صاحب جیؒ

اللہ اکبر! کیا خوشی ہے صاحبو! وہ اس موت کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ اس کی تمنا کرتے ہیں اور اس زندگی کا ان کو ایسا یقین ہے کہ اس یقین کے بعضے آثار تک ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے حضرت مرشدؒ نے مرض الموت میں ایک بزرگ سے یہ وصیت فرمائی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر ہو۔ دیکھئے ان کو پورا یقین تھا کہ میں اس حیات کی وجہ سے استماع ذکر(۱) سے متلذذ ہوں گا مگر اتفاق سے ان بزرگ نے کہا کہ مناسب نہیں حضرت اسی پر راضی ہوئے اور کسی کو اس وصیت کی اطلاع نہیں ہوئی، اتفاق سے جس وقت جنازہ چلا اسی کے ساتھ ایک عرب تھے انہوں نے للکار کر کہا ''أیها الناس أذکروا اللّٰه'' (اے لوگو! خدا تعالیٰ کو یاد کرو) چنانچہ ذکر ہونے لگا، یہ کرامت ہے کہ ان حضرات کی تمنا پوری ہوکر رہتی ہے خوب کہا ہے؟ تو چنیں خواہی خدا اس خواچنیں۔ اور ایک دوسرے بزرگ نے یہ وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے چلیں:

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو شیئًا للّٰہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و بربازوئے تو(۲)

حضرات! اگر روح میں حیات نہ تھی تو یہ وصیتیں کیوں کیں اور فقط یہ نہیں کہ یہ محض ان کا خیال ہی ہو بلکہ بعض اوقات آثار کا بھی ظہور ہوا ہے۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت ہے کہ جب ان کا انتقال ہوگیا اور جنازہ لے چلے تو جنازے پر ان کے ایک خادم نے یہ اشعار پڑھنا شروع کیے:

سر وسیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی(۳)

(۱) ذکر الٰہی سنکر لذت حاصل کروں گا (۲) ''مفلس ہیں ہم اور تیرے کوچہ میں آئے ہیں تیرے رُخ انور کے جمال سے اللہ کے لیے کچھ مجھ کو بھی، ہاتھ کھول ہماری بھیک کی جھولی کی طرف شاباش تیرے ہاتھ اور بازو پر'' (۳) ''ہمارا سیر وسیمین ہمارا وہ محبوب جن کا قد سرو جیسا اور جسم چاندی جیسا ہے جنگل کی طرف جاتا ہے بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جاتا ہے اے پیارے تیرا چہرہ تماشا گاہ عالم ہے تو تماشا کے لیے کہاں جاتا ہے''۔

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ آخر یہ کس چیز نے ہاتھ بلند کرادیا تھا۔ پھر کیا یہ کہنا غلط ہے کہ

ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما (۱)

مگر مجھے خوف ہے کہ جہلاء ان کو زندہ سمجھ کر ان سے مرادیں نہ مانگنے لگیں لیکن مرادیں مانگنا زندوں سے کب جائز ہے کہ بر تقدیر ان کی زندگی کے ان سے جائز ہو دوسرے ان سے مانگو تو وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو، مال و دولت یا اولاد ان کے پاس کہاں ہیں کہ وہ تم کو دیدیں گے ان کے پاس صرف ایک چیز ہے جس کو ساری عمر انہوں نے ڈھونڈا اور اسی میں عمریں تمام کردیں یعنی خدا تعالیٰ، سو اس کو اس کی مرضی کے موافق ان سے مانگو تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ زندگی کیسی زندگی ہے اور اس کے حاصل ہونے کا طریق کیا ہے علمِ دین سیکھو اس پر عمل کرو اور اس عمل کو حال بنالو اس سے دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی، دنیا اس معنی کو کہ تم کو راحت کلی نصیب ہوگی یہ نہیں کہ بہت سا مال مل جائے گا۔

تفسیر آیت متلوہ (۲)

آگے ارشاد فرماتے ہیں: إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (بے شک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست بہت بخشنے والا ہے) سبحان اللہ! کیا بلاغت ہے کہ اول عزیز فرمایا اس کے بعد غفور پر خاتمہ آیت کیا، کیونکہ اگر اس کا عکس کرتے کہ اول غفور فرماتے اور پھر عزیز فرماتے تو چونکہ خاتمہ مضمون جلال پر ہوتا اس لیے غلبہ خوف سے مایوسی ہوجاتی کہ ہم تو اس قدر گنہگار اور خدا تعالیٰ ایسے قہار تو ہماری مغفرت کس طرح ہوگی۔ برخلاف اس ترتیب کے کہ اس میں خاتمہ مضمون رحمت پر فرمایا ہے جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اول کچھ باز پرس ہوئی بھی تو انتہا رحمت ہی پر ہوگی۔ لہٰذا تم مایوس نہ ہوجاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین۔ (۳)

(۱) ''اس عالم پر میری حیات جاودانی ثابت ہوگئی'' (۲) تلاوت کی گئی آیت کی تفسیر (۳) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
۳۰/۱/۲۰۲۰

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی
ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

۱۔ ملک میں موجود وبائی مرض (کرونا) اور موجودہ حالات کے پیش نظر جامعہ کا ماہنامہ الامداد گزشتہ ماہ مئی ۲۰۲۰ء میں شائع نہ ہوسکا۔ اپریل کے بعد جون کا شمارہ شائع کیا جارہا ہے۔

۲۔ رئیس الجامعہ حضرت قاری احمد میاں تھانوی صاحب دامت برکاتہم نے تمام احباب سے دعاؤں کے خاص اہتمام کو جاری رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اللہ تعالی پوری امت کو جلد از جلد موجودہ وبائی آزمائش سے خلاصی عطا فرمائے اور مسلمانوں کو ہر شر وفتنہ سے محفوظ فرمائے۔ آمین

۳۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ مواعظ کا چھبیسواں وعظ ''اصلاحِ نفس'' طبع ہو چکا ہے، صاحبِ ذوق حضرات ادارہ سے وصول کر سکتے ہیں۔

۴۔ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ میں تکمیلِ قرآن انتیسویں شب کو ہوا، جس میں عالمی وبائی مرض سے نجات کے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کیا گیا۔